سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے گجرات کے علمی کارناموں اور وہاں کے فضلاء کے بارہ میں اپنی کتابوں میں مختلف معلومات جمع کردیے ہیں، مصنف نے انہی کتابوں کی مدد سے گجرات کی علمی، تعلیمی اور دینی خدمات کا یہ مرقع سلیقہ سے ترتیب دیا ہے، مگر یہ کتاب مزید محنت وکاوش اور تفصیل کی متقاضی تھی تاکہ آئندہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے یہ اچھا ماخذ بھی بن جاتی۔

نفقہ مطلقہ کے بارے میں سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ } مرتبہ مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۴۰، قیمت ۳ روپیے، پتہ یو۔پی ایکشن کمیٹی مسلم پرسنل لابورڈ۔ ندوۃ العلماء۔ پوسٹ بکس ۹۳، لکھنؤ۔

مطلقہ عورت کے نفقہ کے متعلق سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف مسلمانوں کے تمام طبقوں میں شدید ردعمل پایا جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں اس موضوع پر برابر مضامین اور کتابچے لکھے جارہے ہیں، یہ رسالہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس میں فیصلہ کے نقائص اور خامیوں کی نشاندہی کرکے اس کے دور رس اثرات وخطرات سے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے، اور کتاب وسنت اور کتب فقہ کی روشنی میں اس کا واقعی شرعی حکم بیان کرکے اس کی مختلف حکمتیں اور مصلحتیں بتائی گئی ہیں، اس طرح نفقہ کے اصل شرعی حکم کے بارہ میں شعوری یا غیر شعوری طور پر جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں، وہ رفع کردی گئی ہیں۔ لائق مصنف نے حکومت کے ایک نوجوان وزیر کی اس تقریر کا جائزہ بھی لیا ہے، جو عدالتی فیصلہ کی تائید میں پارلیمنٹ میں کی گئی تھی، اس سے اس کی بے بنیاد باتوں اور غلط حوالوں کی مکمل تردید ہوگئی ہے۔ آخر میں متاع طلاق کے بارے میں ایک مفید بحث بھی شامل ہے، یہ رسالہ وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لیے سنجیدہ اور علمی انداز میں لکھا گیا ہے۔ جو لائق مطالعہ ہے۔

"ض"

جلد ۱۳۷ ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ مارچ سنہ ۱۹۸۶ء عدد ۳

مضامین

شذرات — سید صباح الدین عبدالرحمٰن — ۱۶۲ - ۱۶۴

مقالات

امام اشعری اور مستشرقین — جناب مرزا محمد یوسف صاحب، سابق استاذ مدرسہ عالیہ رام پور — ۱۶۵-۱۸۶
مولانا شبلی بحیثیت مورخ — پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ — ۱۸۷-۲۱۵
کلکتہ میں کل ہند فارسی اساتذہ کانفرنس — ڈاکٹر محمد امین کلکتہ یونیورسٹی — ۲۱۶-۲۲۶

وفیات

آہ مولانا ابوسلمہ! — پروفیسر مسعود حسن صدر شعبۂ عربی وفارسی مولانا آزاد کالج کلکتہ — ۲۲۷-۲۳۲
مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۲۳۳-۲۳۶

شذرات

اجودھیا کی بابری مسجد کا تالا جب سے کھولا گیا ہے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جا بجا ایسی خوں ریز کشیدگی پیدا ہو گئی ہے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد قومی یکجہتی اور متحدہ قومیت کا جو سبق پڑھایا گیا تھا، وہ بالکل بھلا دیا گیا ہے۔

مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی تاریخ کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اگر ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کا کوئی استاد یہ ثابت کر دے کہ بابری مسجد رام جنم بھومی مندر کو توڑ کر بنائی گئی تو ہم مسلمانوں سے اپیل کریں گے کہ وہ اجودھیا جا کر اس کو اپنے ہاتھوں سے منہدم کر دیں، کیونکہ کسی غاصبانہ قبضہ والی زمین پر مسجد بنانا اور وہاں نماز پڑھنا مسلمانوں کے لیے مذہباً ناجائز ہے، بنو امیہ کے زمانہ میں ولید بن عبد الملک نے دمشق میں ایک شاندار مسجد بنانے کا ارادہ ظاہر کیا، اس کے لیے زمین کی کمی پڑی تو اس نے پڑوس کے ایک گرجے کی زمین عیسائیوں سے مانگی، انھوں نے یہ کہہ کر زمین دینے سے انکار کیا کہ خوشی سے تو نہیں دے سکتے، زبردستی سے لی گئی تو لینے والے کو کوڑھ ہو جائے گا، ولید کو غصہ آگیا اور یہ کہہ کر زمین لے لی کہ دیکھیں کیسے کوڑھ ہوتا ہے، حضرت عمر بن عبد العزیز کا زمانہ آیا تو عیسائیوں نے ان سے شکایت کی، حضرت عمر بن عبد العزیز خلفائے راشدین کے اسوۂ حسنہ پر چلتے تھے، انھوں نے حکم دیا کہ مسجد کا وہ حصہ جو گرجے کی زمین پر تعمیر ہوا ہے فوراً منہدم کرا دیا جائے اور سرکاری خرچ سے گرجے کی تعمیر از سر نو ہو۔

(خطبات شبلی، ص ۷۵ - ۷۴)

اگر ہندو مورخین مستند اور معاصر تاریخوں سے یہ ثابت کر دیں کہ یہ مسجد رام جنم بھومی مندر کی جگہ پر بنائی گئی ہے تو مسلمان وہی مثال پیش کرنے کے لیے تیار ہیں جو حضرت عمر بن عبد العزیز نے پیش کی تھی، مگر مسلمان غلط قسم کی تاریخی تحقیقات، دور از کار قیاسات، گمراہ کن معلومات، حکومت کے بے جا فیصلے، اعصابی جنگ، اخبارات کے پروپیگنڈے سے مطمئن، مرعوب اور مغلوب نہیں ہو سکتے،

غور کرنے کی ضرورت ہے کہ بابری مسجد کو بنے ہوئے چار سو تراسی برس گذر گئے، اس جگہ پر اس کے قائم رہنے کی وجہ سے کیا ہندو مذہب کے فروغ میں رکاوٹ پیدا ہوتی رہی یا ۱۹۴۹ء میں جب اس میں تالا لگا دیا گیا تھا تو اس وقت سے اب تک اس تالا بندی سے ملک کی قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی میں ترقی نہ ہو سکی ؟ کیا اس کا تالا کھولنے سے ملکی مفاد اور قومی بہاؤ میں رخنہ نہیں پڑا ؟

یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ اور گنجلک نہیں تھا جتنا کہ اب اس کو بنا دیا گیا ہے، خود وطن دوست ہندو اس پر سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے، کہاں تک صحیح ہے، دہلی کے ڈاکٹر آر. ایل. شکلا نے اپنے ایک مضمون میں ایسی باتوں کا انکشاف کیا ہے جس سے رامائن اور رام دونوں کی حیثیت مشکوک اور مشتبہ ہو جاتی ہے، وہ لکھتے ہیں: "رامائن میں شروع میں صرف چھ ہزار اشلوک تھے، پھر بارہ ہزار اور آخر میں چوبیس ہزار ہو گئے، یہ آج تک پتہ نہیں چلایا جا سکا ہے کہ کن کن لوگوں کی طرف سے یہ اضافے ہوتے گئے، پھر اشلوک کے ان اضافوں سے تاریخ مرتب کرنا ممکن نہیں، رام چندر جی کا دور مہا بھارت سے بہت پہلے اور حضرت عیسیٰؑ سے ڈھائی ہزار سال پہلے بتایا جاتا ہے، مہا بھارت کی لڑائی حضرت عیسیٰؑ سے ایک ہزار سال پہلے ہوئی، پھر رامائن میں جن جگہوں کا ذکر ہے وہاں انسانی آبادی کا نشان ملنا چاہیے، اس کی تلاش میں اتر پردیش میں تین جگہوں پر کھدائی ہوئی، فیض آباد ضلع میں اجودھیا، پھر الہ آباد سے ۳۵ کلو میٹر اتر کی طرف شرنگویر پور اور پھر الہ آباد شہر میں بھاردواج آشرم میں ہوئی، آج سے تقریباً پچیس سال قبل وہاں جو کھدائی ہوئی اس سے وہاں انسانی آبادی کے نشان حضرت عیسیٰؑ سے چھ سو سال سے اوپر کے زمانہ کے نہیں ملے، پھر دس سال پہلے وہاں جو کھدائی ہوئی تو حضرت عیسیٰؑ سے سات سو سال

پہلے کے کچھ نشانات ملے، اب اگر یہ مان لیا جائے کہ یہی اجودھیا رام کا شہر تھا، اور یہیں ان کی جنم بھومی ہے تو رام کا ڈھائی ہزار سال پہلے کا زمانہ اجودھیا کے پتہ چلائے ہوئے آثار سے میل نہیں کھاتا۔

ڈاکٹر شکلا لکھتے ہیں کہ بودھ کے زمانہ میں اجودھیا میں جو حکومت قائم ہوئی اس کے نشانات کا پتہ چلتا ہے، مگر اس سے پہلے کی حکومت اور تہذیب کے آثار کا بالکل پتہ نہیں ہے، اس لیے جو لوگ اجودھیا میں کسی جگہ کو رام جنم بھومی مانتے ہیں ان کی تائید نہ تو تاریخ اور نہ آثار قدیمہ سے ہوتی ہے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ رامائن کے اجودھیا اور موجودہ اجودھیا میں بڑا فرق ہے، رامائن میں ہے کہ کوسل کا دارالسلطنت ایودھیا سرجو ندی کے کنارے پر ضرور تھا، مگر ندی سے کافی دور ساڑھے تیرہ میل پر تھا، مگر آج کا ایودھیا ندی سے بالکل قریب ہے، رامائن میں یہ بھی ہے کہ سرجو ندی مغرب کی جانب بہتی ہے اور گنگا سے کچھ دور ہے، مگر آج کل یہ ندی پورب کی جانب بہتی ہے، اور یہ ریتی میں نہ کہ گنگا میں جاکر ملتی ہے، ڈاکٹر شکلا نے یہ بھی پورے وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ راون اور رام کی لڑائی کا ثبوت بھی کتبے اور آثار قدیمہ سے نہیں ملتا، وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ رامائن میں ذکر ہے کہ شرنگویر پور میں گنگا پار کرکے رام بھاردواج آشرم گئے، مگر ان دونوں جگہوں کی کھدائی ہوگئی ہے، جس میں حضرت عیسیٰؑ سے سات سو سال پہلے کی انسانی آبادی کا پتہ نہیں چلتا ہے۔

رام چندر جی کی شخصیت اور اہمیت رامائن ہی سے متعین ہوتی ہے، اس سے پہلے ان کا ذکر کہیں اور نہیں آتا، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ رامائن کب اور کیسے لکھی گئی؟ آج سے انچاس ۴۹ برس پہلے اسی رسالہ معارف میں اس پر بحث چھڑی تھی، رامائن کا تجزیہ کرتے ہوئے راج مندری (دکن) کے مسٹر ملادی وین کٹا رتنام سابق وائس چانسلر گورنمنٹ ٹریننگ کالج راج مندری نے ایک کتاب ”رام مصر کا فرعون“ کے نام سے لکھی ہے، اس میں انھوں نے ایسی باتوں کا انکشاف کیا ہے کہ جن کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، ان کا خیال ہے کہ رامائن ایک مصری فرعون رامسیس ثانی کے قصہ سے ماخوذ ہے، خود رام کا نام ہندی الاصل

نہیں، بلکہ سامی الاصل ہے، سیریا کے ایک بادشاہ کا یہی نام تھا، رامائن کا دوسرا زبردست کردار سیتا جی ہیں، رامائن ہی کا بیان ہے کہ یہ نام اس لیے پسند کیا گیا تھا کہ جنک نے ہل چلاتے وقت ان کو پایا تھا، بالفاظ دیگر وہ کسی عورت کے بطن سے پیدا نہ ہوئی تھیں، بلکہ دھرتی ماتا کی اولاد تھیں، لیکن سیتا ایک بہت ہی قدیم مصری نام ہے، وہاں اب بھی دولت مند خواتین کے نام کے ساتھ عزت اور ادب کے لحاظ سے اس کو لگا دیا جاتا ہے، قاہرہ میں آج بھی ایک مسجد سیتا زینب کہلاتی ہے،

وین کٹا رتنام نے اسی طرح رامائن کے اور ناموں کی تطبیق مصری ناموں سے کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم آثار میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی جس سے ثابت کیا جائے کہ رام چندر جی نے کسی خطہ پر حکومت کی، یہ ایک مصری کہانی ہے جس کو ہندوؤں کے مزاج کے مطابق ایک مقدس رنگ دے دیا گیا ہے، یہ خیال کہاں تک صحیح ہے اس سے ہم کو بحث نہیں، مگر ملادی وین کٹا رتنام نے اس کی تصنیف کا جو زمانہ متعین کیا ہے، اس سے ضرور دلچسپی ہے۔

وین کٹا رتنام کا دعویٰ ہے کہ رامائن میں بودھ مت کے حوالے اکثر جگہ موجود ہیں، مثلاً جب رام اور لکشمن وشوامتر رشی کے ساتھ راکششوں کو قتل کرنے جا رہے تھے اور متھلا پہونچے تو گوتم کے سب سے بڑے بیٹے ستانند سے ملاقات ہوئی، اس کے معنی یہ ہوئے کہ رام چندر جی گوتم بدھ کے بعد ہوئے، کیا یہ صحیح ہے؟ یا رامائن کی یہ روایت صحیح نہیں ہے؟ اگر اس میں گوتم بدھ کے لڑکے کا ذکر ہے تو یہ تصنیف چھٹی صدی عیسوی کی قرار دی جا سکتی ہے، اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ رام چندر جی حضرت عیسیٰؑ سے ڈھائی ہزار سال پہلے پیدا ہوئے تو پھر رامائن ان کے تین ہزار سال کے بعد لکھی گئی جو کتاب کسی معاصر ماخذ یا مستند اثری اور کتبی شہادتوں کے بغیر قلمبند ہوتی ہے، اس میں سنی سنائی ہوئی روایتوں کا سہارا زیادہ ہوتا ہے، جس میں مورخوں کے نزدیک تاریخیت نہیں ہوتی۔

وین کٹا رتنام لکھتے ہیں کہ خود رامائن میں ہے کہ نرد پہلا شخص ہے جس نے بالمیک کو یہ افسانہ سنایا

اس میں اس نے کیسی رنگ آمیزی کی، اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بالمیک ہندو نہ تھا، کوئی بدیسی نووارد تھا، راماین میں یہ بھی ہے کہ نرد برہما کا بیٹا تھا، جس کو رام کا قصّہ سنانے کے لیے برہما نے بالمیک کے پاس آسمان سے بھیجا، جس کے بعد وہ پھر آسمان کی طرف چلا گیا، مگر راماین میں ایک جگہ یہ بھی ہے کہ چترکوٹ میں بالمیک اور رام چندر کی ملاقات ہوئی، رام چندر جی نے اپنا جو قصّہ سنایا، اسی کو بالمیک نے قلمبند کر دیا، وین کٹارتنام لکھتے ہیں کہ اس تضاد کا اندازہ خود مورخین کر سکتے ہیں، وین کٹارتنام جو چاہیں لکھیں مگر ہندو راماین کو ایک آسمانی صحیفہ سمجھتے ہیں تو ہم کو ان کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہوئے اس پر زیادہ بحث کرنے کا حق نہیں۔

راماین میں جو عجیب وغریب واقعات لکھے گئے ہیں، وین کٹارتنام نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے، وہ لکھتے ہیں: "بال کھنڈ میں سیتا اور رام کی شادی کے وقت جو نسب نامہ دیا گیا ہے وہ یہ کہ وشنو سے برہما جی پیدا ہوئے، برہما کے لڑکے اکش وشو تھے، اکش وشو کے بیٹے دسرتھ تھے، جو رام چندر جی کے باپ تھے۔ دسرتھ نے ساٹھ ہزار سال تک حکومت کی اور رام چندر گیارہ ہزار برس تک تخت نشین رہے، راون کے دس سر تھے، رام کا حریف ومقابل راون تھا، جو راماین کے تمام افراد میں سب سے زیادہ عجیب وغریب ہے، کیونکہ وہ ایک برہمن اور ویدوں کا مفسر بھی بتایا جاتا ہے، راون کا ماخذ سنسکرت کا لفظ "راو" بتایا گیا ہے، جس کے معنی ہیں چلانا یا پکارنا، اس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ راون اور شیو میں جنگ ہوئی، راون نے اس پہاڑ کو جس پر شیو جی بیٹھے ہوئے تھے اکھاڑ کر آسمان کی طرف پھینک دیا، شیو جی نے غصہ میں پاؤں کے انگوٹھے سے پہاڑ کو دبایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ پھر زمین پر آگرا، اور راون کا ہاتھ اس کے نیچے دب گیا، اور وہ چلانے لگا، اور آخر شیو جی نے ترس کھا کر راون کا ہاتھ نکال دیا، اس وقت سے راون شیو جی کا معتقد ہو گیا، اور جب ہی سے راون کہلایا، "دس کنٹھ" اور "دس گریو" اس کا لقب ہے، کیونکہ

راماین کے مطابق وہ دس سروں والا انسان تھا، اور جب رام چندر جی سے جنگ ہو رہی تھی تو اس کا ایک سر کٹنے کے بعد اس کی جگہ نیا سر پیدا ہو جاتا تھا، یہاں تک کہ رام چندر جی کی تلوار نے ایک سو ایک سر کاٹ ڈالے، اسی لڑائی کے ذکر میں ہے کہ بندروں نے رام چندر جی کی حمایت کی اور وہ ہمالیہ سے پتھر لاتے تھے اور آسمان تک لے جاتے تھے، اور سمندر کو ایک جست میں پھاند جاتے تھے، ایسے تمام واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے وین کٹارتنام لکھتے ہیں کہ یہ خلاف عقل بیانات شاعرانہ تخیل کے لیے تو جائز سمجھے جا سکتے ہیں، لیکن تاریخ کیا افسانہ کے معیار سے بھی گر جاتے ہیں، پھر اپنی طرف سے یہ کہنا ہے کہ جب ہندو ان باتوں کو سچ سمجھ کر ان پر مذہبی اعتقاد رکھتے ہیں تو ہمارے لیے اس پر جرح وقدح کی گنجائش نہیں، البتہ اس کی طرف خیال ضرور جاتا ہے کہ اگر راماین کے مطابق راجہ دسرتھ اور رام چندر جی کی حکومت اکہتر ہزار سال رہی تو پھر عام روایت جو یہ ہے کہ ان کا زمانہ حضرت عیسیٰؑ سے پچیس ہزار سال پہلے تھا، تو دونوں کی حکومت کو سامنے رکھتے ہوئے ان کا عہد حضرت عیسیٰؑ سے چھیانوے ہزار سال پہلے رکھنا ہوگا۔

وین کٹارتنام یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے آثار الصنادید بھی کوئی چیز ایسی نہیں پیش کر سکتے جس کو رام چندر جی کی یادگار کہا جا سکے، چترکوٹ، رام ٹیک، پنچ وٹی، غرض تمام ایسے مقامات پر جن کو رام کے گذرگاہ ہونے یا قیام کا شرف حاصل ہوا ہے، سوائے ان مندروں کے جو عقیدت مندوں نے بعد میں تعمیر کر دیے ہیں، بلکہ اکثر مقامات کا وقوع بھی مشتبہ ہے، کیونکہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی صوبہ ایسا ہو جہاں کے دو چار مقامات پر رام کا گذر نامزد نہ ہو، گوداوری کے قریب بہت دور مشرق کی طرف ہٹا ہوا ایک اور مقام "پرناسالہ" نامی بھی رام کی قیام گاہ بتائی جاتی ہے، پرناسالہ اور پنچ وٹی یہ دونوں مقام وہ ہیں جہاں سے کہا جاتا ہے کہ راون سیتا کو لے گیا، یہ دعویٰ ان تمام مقامات کی فرضی حیثیت پر روشنی ڈالتا ہے، جن کو رام کے سفر وحضر سے منسوب کیا جاتا ہے۔

دین کنار تنام یہ بھی لکھتے ہیں کہ دسرتھ کی ایک بڑی سلطنت کوسل نامی دریائے سرجو کے کنارے واقع تھی، اس کا دارالسلطنت اجودھیا تھا، جس کو خود منو نے آباد کیا تھا، اس کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں اور ایک ناقابل عبور خندق اس کی حفاظت کے لیے تھی، یہاں ایسے ایسے آلاتِ حرب موجود تھے، جو ایک دم سو سو آدمیوں کو ہلاک کر سکتے تھے، کئی محل، بہت سی منزلیں اور عمارتیں اس کی رونق تھیں، اجودھیا کا یہ شہر دنیا میں جواب نہ رکھتا تھا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے دین کنار تنام لکھتے ہیں کہ شہر اجودھیا کی عظمت، خوبصورتی اور استحکام کا جو ذکر ہے اس کے لیے گواہی دینے والی ایک اینٹ بھی موجود نہیں، اجودھیا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، ممکن ہے کہ یہاں کچھ بدیسیوں نے آ کر نوآبادی قائم کرلی ہو اور اس سے رام کی روایت ملک میں پھیل گئی۔

رامائن پر اس قسم کی تنقید یں ہندوؤں کو ضرور ناگوار گذریں گی، مگر یہ ہندوؤں کی ہی لکھی ہوئی ہیں، اس لیے وہ غور و فکر کی دعوت ضرور دیتی ہیں، اور اگر رامائن میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، اس کو وہ اپنے سینے سے لگائے رکھنا ہی پسند کرتے ہیں تو اس میں کسی قسم کی مداخلت کی ضرورت بھی نہیں، وہ رامائن کو ایک مقدس کتاب اور اجودھیا کو ایک پوتر استھان ضرور سمجھیں، مگر خدارا اجودھیا کی کسی تاریخی چیز اور خصوصاً بابری مسجد کو غلط قسم کے تاریخی حوالے دے کر اس کو اس طرح متنازع فیہ نہ بنا دیں جس سے ملکی مفاد اور جذباتی ہم آہنگی خطرہ میں پڑ جائے، اور ملک میں ہر طرف نفرت کی آگ بھڑکتی ہوئی دکھائی دے۔

مقالات

امام اشعری اور مستشرقین

از جناب مرزا محمد یوسف صاحب سابق استاد مدرسہ عالیہ رام پور،

(۲)

۵ - کتاب کبیر فی الصفات:۔ معتزلہ، جہمیہ، اور دوسرے مخالفین کے رد میں ہے، علم قدر اور دوسری صفات الٰہی کے سلسلہ میں ابوالہذیل، معمر، نظام، اور فوطی کے رد میں اور عالم کو ازلی ماننے والوں کے رد میں اور اس بحث میں کہ خدا کا چہرہ ہے، اس کے ہاتھ ہیں، اور وہ کرسی عرش پر قائم ہے۔ "لمعہ ناشی" اور اس کے عقیدہ اسماء و صفات کی تردید بھی اس میں شامل ہے۔[1]

اصل میں ہے -

"والفنا کتابا کبیرا فی الصفات تکلمنا علی اصناف المعتزلۃ والجھمیۃ والمخالفین لنا فیھا فی نفیھم علم اللہ وقدرتہ وسائر صفاتہ وعلی ابی الھذیل ومعمر و نظام والفوطی وعلی من قال بقدم العالم وفی فنون کثیرۃ من فنون الصفات فی اثبات الوجہ للہ والیدین وفی استوائہ علی العرش وعلی الناشی ومذھبہ فی الاسماء والصفات"[2]

(ہم نے ایک مبسوط کتاب صفات باری سے متعلقہ مسائل میں تالیف کی جس میں ہم نے

---

[1] معارف ص ۷۹ سطر ۱۳ - ۱۴ [2] تبیین ص ۱۲۹ سطر ۱۳ - ۱۴

i ۔ مختلف فرقہ ہائے معتزلہ وجہمیہ اور اسی طرح ان دوسرے لوگوں کا رد کیا ہے جو صفات باری کے باب میں ہمارے مسلک کے خلاف مذہب رکھتے ہیں، اور جو اللہ تعالیٰ کے علم قدرت اور دیگر صفات کی نفی کرتے ہیں۔

ii ۔ اور ابو الہذیل، معمر، نظام، اور فوطی کا رد کیا ہے، اور اسی طرح ان لوگوں کا رد کیا ہے، جو قدم عالم کے قائل ہیں،

iii ۔ اور صفات باری سے متعلقہ دوسرے بہت سے مسائل کی توضیح وتبیین کی ہے، مثلاً ہم نے اللہ تعالیٰ کی صفات الوجہ، الیدین اور الاستواء علی العرش ثابت کیا ہے۔

iiii ۔ اور الناشی" اور "الاسماء والصفات" کے باب میں اس کے مذہب کا رد کیا ہے۔

لیکن کیا میکارتھی کی اس عبارت "معتزلہ، جہمیہ اور دوسرے مخالفین کے رد میں ہے، علم قدر اور دوسری صفات الٰہی کے سلسلہ میں" سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے، کہ معتزلہ وجہمیہ اور دوسرے مخالفین اشاعرہ صفات باری کے منکر تھے، یا قائل، بلکہ ذہن تو اس بات کی جانب متبادر ہوتا ہے، کہ معتزلہ وجہمیہ وغیرہ وغیرہ صفات باری کے قائل ہوں گے، اور امام اشعری منکر جبھی تو انھوں نے ان کا رد کیا ہے، جیسا کہ عبارت ..... کے رد میں ہے علم قدر اور دوسری صفات الٰہی کے سلسلہ میں" سے معلوم ہوتا ہے، حالانکہ یہ منشاء عبارت اور نفس واقعہ کے خلاف ہے۔ چنانچہ معتزلہ کے متعلق امام عبد القاہر البغدادی نے الفرق بین الفرق میں لکھا ہے۔

وجمعها كلها في بدعتها اداى	اور تمام معتزلہ میں کچھ عقائد مشترک ہیں،
المعتزلة) امور فلها نفيها كلها	ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ سب لوگ
عن الله عزوجل صفاته الازلية	اللہ عزوجل کی صفات ازلیہ کا انکار کرتے
وقولها بانه ليس لله عزوجل علم	تھے، اور کہتے تھے، کہ نہ اللہ عزوجل کے واسطے
ولا قدرة ولا حياة ولا سمع	علم ہے، نہ قدرت، نہ حیات نہ سمع نہ بصر

ولا بصر ولا صفة ازلية [1]	اور نہ کوئی ازلی صفت۔

اس کے مقابلہ میں اشاعرہ کے متعلق شرح المواقف میں لکھا ہے۔

ذهبت الاشاعرة الى ان له	اشاعرہ کا مذہب یہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ
تعالى صفات موجودة قديمة	کی صفات ہیں، جو موجود ہیں، قدیم ہیں،
زائدة على ذاته فهو عالم بعلم قادر	اور اس کی ذات پر زائد ہیں پس وہ علم کے
بقدرة مريد بارادة۔	ساتھ عالم ہے، اور قدرت کے ساتھ
	قادر ہے، اور ارادہ کے ساتھ مرید ہے۔

دوسری چیز جو محل نظر ہے، وہ یہ ہے، کہ تبیین میں "قدرتہ" کا لفظ ہے، اور مسٹر میکارتھی نے اس کا ترجمہ "قدر" سے کیا ہے، حالانکہ قدرت اور قدر کے مفاہیم میں بڑا فرق ہے، قدرۃ کا ترجمہ قدرت ہونا چاہیے تھا، کیونکہ قدرۃ، باری تعالیٰ کی (Omnipetence) کا نام ہے، اور "قدر" (Predestination) کا، چنانچہ شرح المواقف میں "قدرت باری" کی توضیح میں لکھا ہے۔

المقصد الثاني في قدرته	دوسرا مقصد قدرت باری تعالیٰ کے بیان
.... إنه تعالى قادر اى يصح	میں ..... اللہ تعالیٰ قادر ہے یعنی اس کیلئے
منه ايجاد العالم وتركه فليس	عالم کا وجود میں لانا یا نہ لانا دونوں صحیح ہیں،
شئ منهما لازم لذاته	ان دونوں میں سے کوئی بھی اس کے لیے
بحيث يستحيل انفكاكه	اس طرح لازم نہیں ہے، کہ اس سے
	اسکا منفک ہونا ناممکن ہو۔

اس کے مقابلہ میں قدر (قضاء وقدر) کی توضیح میں لکھا ہے،

[1] الفرق بین الفرق ص ۹۳

اعلم ان قضاء الله عند الاشاعرة هو ارادته الازلية المتعلقة بالاشياء على ما هي عليه فيما لا يزال وقدره ايجاده اياها على قدر مخصوص وتقدير معين في ذواتها على احوالها واما عند الفلاسفة فالقضاء عبارة عن علمه بما ينبغي ان يكون عليه الوجود... والقدر عبارة عن خروجها الى الوجود العيني باسبابها على الوجه الذي تقرر في القضاء۔

جاننا چاہیے کہ قضاء باری سے اشاعرہ کے نزدیک اللہ تعالےٰ کا ارادہ ازلیہ مراد ہے۔ جو اشیاء کے ساتھ متعلق ہوتا ہے، جن پر وہ ہمیشہ رہتی ہیں، اور قدر سے مراد اللہ تعالےٰ کا اشیاء کا وجود میں لانا ہے۔ اس مخصوص اندازے اور معین تقدیر پر جو ان کی ذوات میں ان کے احوال کے مطابق مضمر ہے، اور فلاسفہ کے نزدیک قضاء سے مراد اللہ تعالےٰ کا اس چیز کا علم ہے جو موجود ہونا چاہیے،..... اور قدر سے مراد اس چیز کا وجود عینی میں ان اسباب کے ساتھ آنا ہے۔ جو قضا میں مقرر ہو چکے ہیں۔

تیسری چیز جو یقیناً غلط ہے، وہ "اثبات الوجہ للہ والیدین وفی استوائہ علی العرش" کا لفظی ترجمہ "خدا کا چہرہ ہے، اس کے ہاتھ ہیں۔ اور وہ کرسی عرش پر قائم ہے۔" سے کرنا ہے، یہ ترجمہ تو فرقۂ مشبہہ کا موقف ہے، نہ کہ امام اشعری کا، وہ خدا کے لیے چہرہ، ہاتھ اور قیام علی العرش ثابت نہیں کرتے تھے، بلکہ الوجہ، الیدین اور الاستواء علی العرش کو صفات الٰہی مانتے تھے، مگر ان کی تاویل سے (جس کی ایک شکل موجودہ ترجمہ ہے)، قطعاً بیزار تھے۔ چنانچہ شرح المواقف میں ہے۔

الوجه.... هو كما قبله اعني الاستواء في عدم القاطع وعدم جواز التعويل على الظواهر

الوجہ...... اور وہ اپنے قبل یعنی الاستواء کی طرح ہے۔ یعنی نہ تو کسی تاویل پر تیقن کے ساتھ اصرار کیا جائے گا اور

اليد.... فاثبت الشيخ الصفتين ثبوتيتين زائدتين على الذات وسائر الصفات لكن لا بمعنى الجارحتين۔

نہ ظاہر معنی پر اس کا اعتماد جائز ہوگا امام اشعری نے دو ثبوتی صفتیں ثابت کی ہیں۔ جو ذات اور اس طرح دیگر صفات باری کے علاوہ ہیں، لیکن ان کے معنی ہاتھ کے نہیں ہیں۔

وذهب الشيخ في احد قوليه الى انه اي الاستواء صفة زائدة ليست عائدة الى الصفات السابقة وان لم تعلمها بعينها ولم تقم عليه دليلاً ولا يجوز التعويل في اثباتها على الظواهر من الآيات والاحاديث..... فالحق التوقف بانه ليس كاستواء الاجسام

شیخ کا ایک قول یہ ہے، کہ الاستواء ایک صفت زائدہ ہے، جو سابق صفات کی طرف نہیں لوٹائی جا سکتی، اگرچہ ہم اسکی حقیقت کو نہ جانتے ہوں اور اس پر دلیل قائم نہ کر سکیں، اور اس کے اثبات میں آیات و احادیث کے ظاہر معنی پر اعتماد جائز نہیں ہے۔ . . . پس حق یہ ہے کہ توقف کیا جائے، کہ یہ الاستواء اجسام کے استواء کی طرح نہیں ہے۔

امام اشعری کا یہ مسلک اسلاف اہل سنت والجماعۃ کے مسلک کے عین مطابق ہے جیسا کہ امام مالکؒ سے مروی ہے۔

الاستواء معلوم والكيف مجهول والايمان به واجب والسوال عنه بدعة۔

الاستواء معلوم ہے۔ مگر اس کی کیفیت مجہول ہے، اس پر ایمان رکھنا واجب ہے۔ اور اسکی نوعیت دریافت کرنا بدعت ہے۔

اس لیے صحیح ترجمہ یہ ہونا چاہیے تھا۔

"الوجہ، الیدین، اور الاستواء علی العرش کی صفات کے اثبات میں"

کیونکہ یہ کہنا کہ "خدا کا چہرہ ہے"، اس بات کے مترادف ہے کہ امام اشعری "الوجہ" کی تاویل حسب ظاہر "چہرہ" سے کرتے تھے، حالانکہ یہ تمام محققین کی تصریحات کے خلاف ہے،

شرح المواقف کا قول اوپر مذکور ہوا کہ

عدم جواز التعویل علی الظواہر	ظاہر معانی پر اعتماد ناجائز ہے۔

اسی طرح یہ کہنا کہ "اسکے ہاتھ ہیں" اس بات کے مترادف ہے کہ امام اشعری الید کی تاویل ہاتھ سے کرتے تھے حالانکہ یہ محققین کی تصریحات کے خلاف ہے۔

شرح المواقف میں ہے۔

لکن لا بمعنی الجارحتین	لیکن جارحتین (ہاتھوں) کے معنی میں نہیں۔

اور اسی طرح یہ کہنا کہ "وہ کرسی عرش پر قائم ہے"، امام اشعری کو فرقۂ مشبہہ میں شامل کرنا ہے، حالانکہ وہ اس سے بمراحل دور تھے، جیساکہ محققین نے تصریح کی ہے، شرح المواقف میں ہے۔

والحق التوقف مع القطع بانہ لیس	مذہب حق اس بارے میں توقف ہے اس یقین کے ساتھ
کاستواء الاجسام	کہ وہ استواء اجسام کی طرح نہیں ہے۔

یعنی امام اشعری کم از کم اس بات کے قائل نہیں تھے، کہ "وہ کرسی عرش پر قائم ہے"۔

چوتھی چیز جو قطعاً سمجھ میں نہیں آتی، وہ مسٹر مکارتھی کے ترجمہ کا یہ فقرہ ہے۔

"لمعہ ناسھی"[1]

خدا معلوم یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ اصل میں ہے

وعلی الناشی ومذہب فی الاسماء والصفات	اور الناشی اور الاسماء والصفات کے باب میں اسکے مذہب کا رد

الناشی امام اشعری کا ہم عصر اور مشہور معتزلی متکلم تھا، جس کا سنہ وفات ۲۹۳ھ ہے۔ اس کا نام ابو العباس عبد اللہ بن محمد تھا۔ فہرست ابن الندیم تکملہ (صفحہ ۵) پر اس کے تین شعر بھی

[1] معارف ص ۲۹، سطر ۱۲

نقل ہوئے ہیں۔ الواسطی اس کے علم کلام کا مذاق اڑایا کرتا تھا، چنانچہ ابن الندیم نے نفطویہ کے باب میں اس کا طنزیہ قول نقل کیا ہے۔

ومن ظریف قولہ فی نفطویہ	اور واسطی کا ایک دلچسپ قول نفطویہ
انہ کان یقول من اراد ان	کے متعلق یہ ہے کہ وہ کہا کرتا تھا کہ جو
یتبناھی فی الجھل فلیتعرف	جہالت میں انتہا کو پہنچ جانا چاہتا ہے۔
الکلام علی مذہب الناشی	اس کو چاہیے کہ علم کلام الناشی کے مذہب
والفقہ علی مذہب داؤد بن علی	پر سیکھے اور فقہ داؤد بن علی کے مذہب پر
والنحو علی مذہب نفطویہ	اور نحو نفطویہ کے مذہب پر اور نفطویہ
قال ونفطویہ تیعاطی الکلام	الناشی کے مذہب پر کلام سے بحث
علی مذہب الناشی[1]	کیا کرتا تھا۔

امام اشعری نے الناشی کے مذہب کو "مقالات الاسلامیین" میں متعدد مقامات پر بیان کیا ہے بالخصوص "الاسماء والصفات" کے باب میں، اس کے مذہب کو مقالات کی جلد ثانی کے صفحہ ۵۰۰ و ۵۰۱ پر نقل کیا ہے۔

غرض الناشی مشاہیر معتزلہ میں سے تھا لیکن مستشرقین کے استشراق اور تبحر علمی نے "لمعہ ناسھی" کے ذریعہ اس کی گت بنادی۔

،۔ کتاب کبیر ذکرنا فیہ اختلاف الناس فی الاسماء والاحکام والخاص والعام، گناہ کبیرہ کے مرتکب کے سلسلہ میں اسماء اور احکام[2]۔

"الاسماء والاحکام" علم کلام کی ایک مستقل بحث ہے، چنانچہ شرح المواقف کے موقف ششم کا

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۲۴۵　[2] معارف ص ۲۹، سطر ۱۵-۱۶

تیسرا مرصد اسی بحث پر ہے۔

المرصد الثالث فی الاسماء الشرعیۃ المستعملۃ والاحکام۔

اسی طرح المحصل للامام الرازی کے الرکن الرابع (فی السمعیات) کی قسم ثالث "الاسماء والاحکام" پر ہے۔

"القسم الثالث فی الاسماء والاحکام"[1]

شرح المواقف اور المحصل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ "الاسماء والاحکام" کے زیر عنوان صرف مرتکب کبیرہ ہی کی بحث نہیں ہوتی، بلکہ اور بحثیں بھی مذکور ہوتی ہیں۔ مثلاً شرح المواقف میں "الاسماء والاحکام" کے زیر عنوان چار مقاصد ہیں

المقصد الاول فی حقیقۃ	پہلا مقصد ایمان کی حقیقت کے بارے میں، دوسرا
الایمان المقصد الثانی فی	مقصد اس بارے میں کہ آیا ایمان بڑھتا
ان الایمان ھل یزید وینقص۔	گھٹتا ہے۔
المقصد الثالث فی الکفر	تیسرا مقصد کفر کے بیان میں

ظاہر ہے یہ تینوں بحثیں گناہ کبیرہ کے سلسلہ میں اسماء و احکام سے تعلق نہیں رکھتیں، صرف چوتھا مقصد مرتکب کبیرہ کے احکام کے سلسلہ میں ہے۔

المقصد الرابع فی ان مرتکب	چوتھا مقصد اس بارے میں کہ گناہ
الکبیرۃ من اھل الصلوٰۃ	کبیرہ کا مرتکب مسلمان ہے۔

اسی طرح المحصل للرازی میں "الاسماء والاحکام" کے سلسلہ میں چار مسئلے بیان ہوئے ہیں۔ پہلا مسئلہ حقیقت ایمان کی توضیح میں ہے۔ دوسرا ایمان کی زیادتی و نقصان کے متعلق ہے، تیسرا مسئلہ اس بارے میں ہے کہ "انا مومن انشاء اللہ" کہنا کس صورت میں جائز ہے، اور چوتھا مسئلہ

---

[1] المحصل للرازی۔ ص ۱۷۴۔

حقیقت کفر کی توضیح میں ہے، صرف پہلے مسئلہ کی تفریع کے طور پر مرتکب کبیرہ کے حکم میں جو اختلافات ہیں، ان کی تفصیل ایک ضمنی تنبیہ میں بیان ہوئی ہے۔

غرض مسٹر مکارتھی کا ترجمہ گمراہ کن بھی ہے، اور ناقص بھی۔

"الاسماء والاحکام" کے عنوان کی توضیح میر سید شریف نے شرح المواقف میں اسطرح کی ہے:

المرصد الثالث فی الاسماء	تیسرا مرصد اسماء میں یعنی اسماء شرعیہ
الشرعیۃ المستعملۃ فی اصول	میں جو اصول دین میں مستعمل ہوتے ہیں۔
الدین کالایمان والکفر والمومن	جیسے ایمان، کفر، مومن کافر وغیرہ اور معتزلہ
والکافر و المعتزلۃ یسمونھا،	انہیں (اسماء شرعیہ کے بجائے) اسماء دینیہ
اسماء دینیۃ لا شرعیۃ تفرقۃ	کہتے ہیں، تاکہ ان میں اور ان الفاظ میں
بینھما وبین الالفاظ المستعملۃ	جو فرعی احکام میں مستعمل ہوتے ہیں امتیاز
فی الاحکام الفرعیۃ والاحکام	ہوسکے، اور احکام میں یعنی اس قسم کے
من ان الایمان ھل یزید وینقص	مسائل میں کہ آیا ایمان گھٹتا، بڑھتا ہے
اولا ومن انہ ھل یثبت بین	یا نہیں، اور اس بات میں کہ آیا مومن،
المومن والکافر واسطۃ اولا	اور کافر کے درمیان کوئی درمیانی واسطہ
	ثابت ہوتا ہے، یا نہیں۔

اس توضیح کا مقابلہ مسٹر مکارتھی کے ترجمے سے کیجیئے، تو ان مستشرقین کی وسعت معلومات اور تبحر علمی کا اندازہ ہوسکے گا۔

اس کتاب کے عنوان میں ایک فقرہ اور ہے۔ "الخاص والعام" مگر محقق مستشرق نے اسے درخور اعتنا بھی نہیں سمجھا، بظاہر "الخاص والعام" اصول فقہ کی اصطلاحات ہیں، لیکن یہ کلامی اصطلاح

بھی ہے۔ اور کلامی بحثوں میں اس کا ایک مستقل مفہوم ہے، چنانچہ مختلف فرقوں نے "الخاص والعام" کے سلسلہ میں جو موقف اختیار کیے ہیں، امام اشعری نے مقالات الاسلامیین میں ان کی وضاحت کی ہے، مثلاً جلد اوّل کے صفحہ ۱۴۴ - ۱۴۸ پر مرجیہ کے اختلافات فی العام والخاص کو بیان کیا ہے۔

واختلفت المرجئة فی الاخبار اذا وردت من قبل اللہ سبحانہ وظاہرہا العموم علی سبع فرق۔

اور اخبار جب اللہ تعالےٰ کی طرف سے آئیں، اور ان کا ظاہر عموم کو مقتضی ہو، تو مرجیہ نے ان کے بارے میں اختلاف کیا ہے، اور اسطرح ان کے سات فرقے ہیں۔

اسی طرح صفحہ ۲۷۶ - ۲۷۷ پر معتزلہ کے اختلافات فی الخاص والعام کو نقل کیا ہے۔

واختلفوا اذا سمع السامع الخبر الذی ظاہرہ العموم ولم یکن فی العقل مایخصصہ ما الذی علیہ فی ذالک علی مقالتین۔

جب کہ سننے والا ایسی خبر سنے جس کا ظاہر عموم پر دلالت کرے اور عقل میں کوئی ایسی چیز نہ ہو، جو اس کی تخصیص کر سکے، تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے، اس بارے میں معتزلہ کے دو قول ہیں۔

اس طرح مقالات الاسلامیین کی جلد ثانی میں الخاص والعام کے باب میں فرق اسلامیہ کے اختلافات کو صفحہ ۴۴۵ پر بالاختصار ذکر کیا ہے،

واختلفوا فی الخاص والعام

اور خاص اور عام کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔

"الاسماء والاحکام" کے مباحث کے ساتھ "الخاص والعام" کی بحث کو یکجائی طور پر بیان کرنے کی یہ وجہ تھی، کہ جب بعض آیات گناہ کبیرہ کی وعید میں وارد پائی گئیں، تو سوال یہ پیدا ہوا

کہ آیا ان آیات کو ان کے ظاہر عموم پر محمول کیا جائے، یا اس میں استثنا کی بھی گنجائش ہے، تاکہ

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ

کے ساتھ ان کا محمل ہم آہنگ ہو سکے، فرقہ مرجیہ کا عموماً شق ثانی کی طرف رجحان تھا۔ اور معتزلہ کا شق اوّل کی طرف، بہرحال اس طرح "الاسماء والاحکام" کے مباحث میں "الخاص والعام" کی ابحاث بھی بطور ضمیمہ شامل کر دی گئیں۔

یہ ہے حقیقت "الاسماء والاحکام اور الخاص والعام" کی لیکن حضرات مستشرقین نے اسے صرف گناہ کبیرہ کے مرتکب کے سلسلہ میں اسماء واحکام لکھ کر اپنے ذوق تحقیق وفرض استشراق کو ادا کر دیا۔

۱۶ - کتاب کبیر:- الاصول کے رد میں محمد بن عبد الوہاب الجبائی کے رد میں، معتزلہ کے عقائد کے بیان اور اس کے رد میں، معتزلہ کے ہر اس مسئلہ کے رد میں جس میں ہمارا ان کا اختلاف ہو۔[1] اصل میں ہے۔

الفنا کتابا کبیرا نقضنا فیہ الکتاب المعروف بالاصول علی محمد بن عبد الوہاب الجبائی کشفنا عن تمویہہ فی سائر الابواب التی تکلم فیہا من اصول المعتزلۃ وذکرنا للمعتزلۃ من ابحج فی ذالک بما لم یأت بہ ونقضنا بحجج اللہ الزاہرۃ وبراہینہ الباہرۃ یاتی کلامنا علیہ فی نقض جمیع مسائل المعتزلۃ واجوبتہا فی الفنون التی اختلفنا نحن وہم فیہا۔[2]

یعنی ہم نے ایک مبسوط کتاب تصنیف کی جس میں ہم نے (اپنے سابق استاد مشہور معتزلی متکلم) محمد بن عبد الوہاب الجبائی کی مشہور کتاب الاصول کا رد کیا ہے۔ اور اس میں الجبائی کی ان تمام فریب کاریوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ جو اس نے (مذہب) معتزلہ کے اصول خمسہ کی توضیح وتائید کے سلسلہ

[1] معارف ص ۲۹۸ سطر ۸-۱۰۔ [2] تبیین ص ۱۳۰ سطر ۱۲-۱۴

میں مختلف ابواب میں ذکر کی ہیں۔

(ii) اسی کے ساتھ ہم نے معتزلہ کی ان حجج و براہین کو بھی نقل کیا ہے، (جو وہ اپنے اصول کی تائید و تشیید میں عموماً بیان کرتے ہیں، مگر جو الجبائی کی الاصول میں سے بیان ہونے سے رہ گئی ہیں، (اور چونکہ وہ خود عرصہ تک معتزلی رہ چکے تھے، اور ان کے دلائل و براہین سے واقف تھے، اس لیے ان کا اتماماً للحجہ اس کتاب میں ذکر کر دیا ہے، تاکہ معتزلہ کے پاس اب کوئی حجت نہ رہے۔

(iii) ہم نے اللہ تعالے کی روشن حجتوں اور چمک دار برہانوں سے ان کا (معتزلہ کے دلائل کا) رد کیا ہے۔

(iv) فنون (مباحث) کلام کے مختلف ابواب جن میں ہمارا اور معتزلہ کا اختلاف ہے، معتزلہ کے تمام مسائل اور ان کے جوابات (یعنی ان مسائل مختلف فیہا میں معتزلہ نے جو مواقف اختیار کیے ہیں۔ اور جن کے اثبات و تائید کی الجبائی نے کوشش کی ہے) کے سلسلہ میں اس کتاب میں ہم اس (الجبائی) پر کلام وارد کرتے ہیں۔

امام اشعری کی یہ کتاب (نقض اصول الجبائی) تقریباً چالیس اجزاء پر مشتمل تھی، اسے ابو نصر الکوازی نے امام اشعری کی دوسری کتابوں کے ساتھ ساتھ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخہ سے نقل کیا تھا، اور الکوازی کے نسخہ سے ابن فورک نے نقل کیا تھا، تبیین میں ہے۔

وعن صحبہ ابو نصر الکوازی بشیراز فانہ قصد ونسخ فیہ کثیرا من کتبہ منھا کتابہ فی النقض علی الجبائی فی الاصول یشتمل علی نحو من اربعین جزءً نسخت انا (یعنی ابن فورک) من کتابہ الذی نسخہ من نسختہ الشیخ ابی الحسن بخطہ[1]

(v) کتاب کبیر۔ نقد تاویل الادلہ کے رد میں البلخی کے رد میں معتزلہ کے اصول میں اس میں ہے۔

[1] تبیین ص ۱۲۸ - [2] معارف ص ۲۹۸ سطر ۱۱ -

الفنا کتاباً کبیراً نقضنا فیہ الکتاب المعروف بنقض تاویل الادلۃ علی البلخی فی اصول المعتزلۃ وبینا عن شبہتہ التی اوردھا بادلۃ اللہ الواضحۃ واعلامہ اللائحۃ وضمنا الی ذلک نقض ماذکرہ من الکلام فی الصفات فی عیون المسائل والجوابات[1]

(ہم نے ایک مبسوط کتاب تصنیف کی۔ جس میں ہم نے

i - ابو القاسم الکعبی البلخی کی مشہور کتاب نقض تاویل الادلہ کا جو معتزلہ کے اصول مذہب میں ہے۔ رد کیا ہے۔

ii - اور اس میں ہم نے ان شبہات کو جنھیں البلخی نے اس کتاب میں وارد کیا ہے، اللہ تعالے کی واضح حجتوں اور روشن نشانیوں کے ساتھ کھول کر بیان کیا ہے۔

iii - اس کے علاوہ البلخی نے اپنی کتاب عیون المسائل نیز اپنے جوابات میں جو موقف صفات باری کے بارہ میں اختیار کیا ہے، ہم نے اس کا رد بھی بطور ضمیمہ کے اصل کتاب کے رد کے آخر میں بڑھا دیا ہے)

اس کے بعد تبیین کذب المفتری کی محررہ بالا تصریحات کا مسٹر مکارتھی کے ترجمہ سے موازنہ کر کے قارئین کرام مستشرقین کی تحقیق کی داد دیں۔ دو باتیں قابل غور ہیں۔

i - نقض تاویل الادلہ، ابو القاسم، الکعبی، البلخی ہی کی کتاب کا نام ہے،

ii - الکعبی البلخی کی کتاب کا نام "نقض تاویل الادلہ" ہے، نہ کہ نقد تاویل الادلہ جیسا کہ بیدار صاحب نے مسٹر مکارتھی سے نقل کیا ہے،

iii - امام اشعری کی اس کتاب میں اصل (نقض تاویل الادلہ کے رد) کے علاوہ ایک ضمیمہ بھی ہے، یعنی الکعبی البلخی کی "عیون المسائل" اور "الجوابات" (رفتادائے کلامیہ) کا رد، مگر مسٹر مکارتھی

[1] تبیین ص ۱۳۰ سطر ۳۰ - ۲۰ -

یا تو اس کو سمجھ نہ سکے، یا نظر انداز کر گئے۔

۱۸۔ کتاب جمل المقالات:۔ ملاحدہ اور نام نہاد اہل التوحید کے رد میں[11]

اصل یوں ہے۔

والفنا کتابا فی جمل المقالات	ہم نے ملاحدہ اور اہل توحید کے جملہ مقالات
الملحدین وجمل اقاویل الموحدین	(مذہبی اقوال و دینی عقائد) کی تبیین
سمیناہ کتاب جمل المقالات[12]	و توضیح پر ایک کتاب لکھی، جس کا نام
	جمل المقالات رکھا۔

معلوم نہیں مسٹر مکارتھی نے "اہل التوحید" سے پہلے "نام نہاد" کا اضافہ کس طرح کر دیا۔ اصل میں تو کوئی لفظ اس اضافہ کی جانب اشارہ کرنے والا نہیں ہے۔

اس سے زیادہ یہ کہ اسی کتاب کا موضوع محض نقل مذاہب ہے نہ کی ان کی تردید، جیسا کہ مسٹر مکارتھی کے محررہ بالا ترجمے سے معلوم ہوتا ہے،

۱۹۔ کتاب الجوابات فی الصفات عن مسائل الزیغ والشبہات، یہ ایک ضخیم کتاب ہے جو ہم نے خود اپنی کتاب کے رد میں لکھی ہے، جو کبھی معتزلہ کی حمایت میں لکھی تھی، معتزلہ کی حمایت میں اب تک ایسی کتاب نہیں لکھی گئی، مگر اب خدا نے ہمیں صحیح راستہ دکھایا اور ہمیں اس کی تردید کے قابل کیا۔[13]

خود مسٹر مکارتھی کو اعتراف ہے، کہ ایک کتاب امام اشعری نے اپنے زمانہ اعتزال میں لکھی تھی، اور دوسری اعتزال سے تائب ہونے کے بعد، اس کے رد میں، اس طرح اس سے ان کی دو تصنیفات کا پتہ چلتا ہے، مگر مسٹر مکارتھی نے اسے ایک ہی سمجھا ہے۔

۲۰۔ کتاب علیٰ ابن الراوندی: صفات اور قرآن کے موضوع پر۔[14] لیکن اس سے کتاب کے

[11] معارف ص ۲۹۰ سطر ۱۴، [12] تبیین ص ۱۳۱ سطر ۱-۳ [13] معارف ص ۲۹۸ سطر ۱۵، [14] ایضاً سطر ۱۸۔

موضوع کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ کیا اچھا ہوتا کہ مسٹر مکارتھی، ابن الراوندی کی علمی زندگی کا مطالعہ کیجئے۔

واقعہ یہ ہے کہ ابن الراوندی تیسری صدی ہجری کا ایک بڑا ملحد اور گمراہ کا مناظر تھا، جب اپنے علم و فضل کی قیمت نہیں ملی، تو دوسرے فرقوں کی خاطر اس نے اسلام کے خلاف کتابیں لکھنا شروع کیں، اور ان سے روپیہ وصول کیا۔ مثلاً شیعوں کے حسب منشا کتاب الامامۃ لکھی، اور ان سے تیس[۳۰] دینار حق تصنیف وصول کئے۔ اس نے حسب تصریح ابن خلکان ایک سو چودہ[۱۱۴] کتابیں لکھیں، ان میں سے کم و بیش انیس[۱۹] کتابوں کے نام آج معلوم ہیں، لیکن موضوع زیر بحث کے لیے مندرجۂ ذیل کتابوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔

ا۔ کتاب خلق قرآن:۔ یہ ابن الراوندی کی اس زمانہ کی تصنیف ہے۔ جبکہ وہ معتزلی المذہب تھا، اس کے نام سے ظاہر ہے، کہ اس کا موضوع "خلق قرآن" تھا، جو معتزلہ کا متفقہ مسئلہ ہے۔[15]

ب۔ کتاب الدامغ فی الرد علی القرآن:۔ اس کے متعلق ابن الندیم نے لکھا ہے۔

کتاب یطعن فیہ علی نظم	ایسی کتاب جس میں نظم قرآن پر اعتراض
القرآن۔[16]	کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا رد ابو علی الجبائی اور ابو القاسم البلخی نے کیا تھا۔ خود ابن الراوندی نے بھی بعد میں اس کا رد لکھا ہے۔

ج۔ کتاب القضیب الذہب:۔ اس میں ابن الراوندی نے ثابت کیا ہے کہ علم باری تعالےٰ محدث ہے، فہرست ابن الندیم میں

کتاب القضیب الذہب وھو	کتاب القضیب الذہب وہ کتاب ہے،
الذی یثبت فیہ ان علم	جس میں وہ ثابت کرتا ہے، کہ اللہ تعالےٰ کا

[15] الفہرست تکملہ ص ۵ [16] ایضاً ص ۵۔

اللہ تعالےٰ بالاشیأ محدث وانہ	علم اشیاء حادث ہے، اور یہ کہ وہ غیر عالم
کان غیر عالم حتی خلق لنفسہ علماً	تھا، یہاں تک کہ اس نے اپنے واسطے
تعالیٰ اللہ۔[۵]	علم کو پیدا کیا تعالےٰ اللہ!

یہ ہیں ابن الراوندی کے الحادات، معاہد التنصیص میں محاسن خراسان لابی القاسم الکعبی البلخی کے حوالہ سے ابن الراوندی کے الحاد و زندقہ کے ضمن میں نقل کیا ہے۔

فمما قالہ فیہ لعنہ اللّٰہ البعدہ	ان چیزوں میں سے جو اس ملعون نے اس
انا نجد فی کلام اکثم بن صیفی	کتاب میں کہی ہیں۔ یہ ہے کہ ہم اکثم بن
شیأ احسن من انا	صیفی کے کلام میں ایسی چیزیں پاتے ہیں جو
اعطیناک الکوثر۔	انا اعطیناک الکوثر سے بھی زیادہ اچھی ہیں۔

ان کفریات کے رد کو متکلمین وقت نے اپنے مساعی علمیہ کا موضوع بنایا۔ اور امام اشعری نے بھی اس فرض منصبی کو باحسن وجوہ انجام دیا۔ چنانچہ انھوں نے ابن الراوندی کے رد میں متعدد کتابیں لکھیں، جن میں سے "کتاب التاج" کے رد میں دو کتابیں ہیں، ایک کتاب الفصول کے ضمن میں (مسٹر مکارتھی کی فہرست نمبر ۱) اور دوسری نقض کتاب التاج (مسٹر مکارتھی کی فہرست میں نمبر ۳۱)، لیکن زیر بحث کتاب میں، امام اشعری نے ابن الراوندی کے ان ہفوات کا رد کیا ہے، جو اس نے قرآن کے مخلوق ہونے کی تائید میں لکھے تھے، نیز کتاب الدامغ میں نظم قرآن کے معجز ہونے پر اس نے جو طعن کیا ہے۔ اور صفات باری بالخصوص علم باری تعالےٰ کے سلسلہ میں اس نے اباطیل کا جو انبار لگا دیا ہے۔ زیر بحث کتاب میں ان سب کا رد ہے۔

۲۲ - القامع لکتاب الخالدی فی الارادہ:۔ خالدی کی کتاب کے رد میں جس میں اس نے

[۱] الفہرست التکملہ ص ۵۔

لکھا ہے، کہ آغاز تو خدا کے ہاتھ میں ہے، مگر بہت سی چیزیں خدا کے ارادہ کے خلاف ہوتی ہیں۔ اور اکثر نہیں ہوتیں۔[۱]

۲۳ - خالدی کی اس کتاب کے رد میں جس میں اس نے انکار کیا ہے، کہ ارادہ اور عمل خدا کی طرف سے ہیں۔[۲]

ان دونوں عبارتوں میں تناقض ہے۔ پہلی میں اقرار ہے، کہ "آغاز تو خدا کے ہاتھ میں ہے" دوسری میں اس بات کا انکار ہے۔ کہ "ارادہ اور عمل خدا کی طرف سے ہیں"

اصل میں ہے۔

(۱) الفنا کتابا نقضنا بہ کتاباً	(۱) ہم نے ایک کتاب تصنیف کی جس میں
للخالدی فی اثبات حدث	خالدی کی اس کتاب کا رد کیا ہے، جو
ارادۃ اللہ تعالےٰ وانہ شاء	اس نے ارادہ باری تعالےٰ کے حادث
مالم یکن وکان مالم یشاء و	ہونے کے ثبوت میں لکھی تھی، اور یہ ثابت
اوضحنا بطلان قولہ فی ذالک	کیا تھا کہ اللہ تعالےٰ نے جو چاہا وہ واقع نہیں
وسمیناہ القامع لکتاب	ہوا، اور وہ ہوا۔ جو اس نے نہیں
الخالدی فی الارادۃ۔[۳]	چاہا تھا۔ اور ہم نے اس کتاب میں اس کے
	قول کے باطل ہونے کی وضاحت کی، اور[۴]
(ب) والفنا علی الخالدی کتابا	(ب) خالدی کے رد میں ہم نے ایک کتاب تصنیف
نقضنا فیہ کتاباً الفہ فی خلق	کی جس میں اس کی اس کتاب کا رد کیا ہے۔
الاعمال وتقدیرھا عن	جو اس نے اس کتاب کے انکار میں لکھی تھی۔
رب العٰلمین۔[۵]	کہ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے[۶]

[illegible]

[۱] معارف ص ۲۹۹ سطر ۳-۴ [۲] ایضاً سطر ۸ [۳] تبیین ص ۱۳۱ سطر ۹، ۱۰ [۴] تبیین سطر ۱۳-۱۴۔

تبیین کی ان توضیحات کا مسٹر کارتھی کے بیان سے موازنہ کیجیے، اور خود فیصلہ کیجیے کہ انھوں نے ان کتابوں کے موضوع کو کہاں تک سمجھا ہے،

خالدی کی کتابیں اس عہد کے جمہور معتزلہ کے انداز فکر تھیں۔ جو خلق اعمال کے منکر تھے۔ اسی موضوع پر خالدی نے اپنی دوسری کتاب (فی نفی خلق الاعمال وتقدیرها عن رب العلمین) کو تصنیف کیا، اور چونکہ امام اشعری خلق اعمال کے معتقد و مؤید تھے۔ لہذا انھوں نے اس کتاب کا رد لکھا۔

ارادۂ باری تعالیٰ کی صفات ثبوتیہ میں سے ہے لیکن مختلف متکلمین نے اس کی ماہیئت میں مختلف مسلک اختیار کیے تھے۔ چنانچہ ابو علی الجبائی اور اس کا لڑکا ابو ہاشم وغیرہ ارادۂ باری کے حادث ہونے کے قائل تھے، امام رازی نے الاربعین میں لکھا ہے۔

اعلم ان المفهوم من كونه تعالى	جاننا چاہیے کہ اللہ تعالے کے مرید ہونے کا
مريداً ... اما ان يكون محدثا	مطلب ... یا تو یہ ہے کہ وہ حادث
وعلى هذا التقدير فهذه	ہے، اور اس تقدیر پر وہ حادث ارادہ
الارادة المحدثة ... موجودة	... موجود ہوگا، مگر کسی محل میں نہیں،
لا فی محل وهو قول ابى على وابى	اور یہ ابو علی، ابی ہاشم اور عبد الجبار
هاشم وعبد الجبار بن احمد[1]	ابن احمد کا مذہب ہے۔

اسی طرح جمہور معتزلہ کا مسلک یہ تھا، کہ اللہ تعالے بندوں کے اعمال کا خالق نہیں ہے کیونکہ بندے اکثر اس کے خلاف مرضی گناہ کرتے ہیں، حالانکہ وہ چاہتا ہے، کہ وہ نیک کام کریں تو گویا کبھی وہ ایسی بات چاہتا ہے، جو واقع نہیں ہوتی، اور کبھی وہ بات ہوتی ہے، جو وہ نہیں چاہتا۔

انه شاء مالم يكن وكان مالم	اس نے وہ چیز چاہی جو واقع نہیں ہوئی
يشاء	اور وہ واقع ہوا جو اس نے نہیں چاہا۔

[1] الاربعین۔ ص ۳۵۰۔

جمہور معتزلہ کے اسی مذہب کو امام اشعری نے مقالات الاسلامیین میں لکھا ہے۔

وزعمت المعتزلة كلها غير ابى	اور تمام معتزلہ نے بجز ابی موسی المزدار کے گمان کیا ہے
موسى المزدار انه لا يجوزان	کہ کسی نہج سے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالے
يكون الله سبحانه مريداً	گناہوں کا ارادہ کرنے والا ہو یعنی بندے
للمعاصى على وجه فى الوجوه	جو گناہ کرتے ہیں، اللہ تعالی کو اس کا ارادہ
ان يكون موجوداً ولا يجوزان	کرنے والا نہیں ٹھہرایا جاسکتا اور نہ یہ جائز ہو
يامر بما لا يريد ان يكون	کہ اس چیز کا حکم دے جس کو وہ نہیں چاہتا،
وان ينهى عما يريد كونه	کہ وہ واقع ہو اور اس چیز سے منع کرے جس کا
وان الله سبحانه قد اراد	ہونا وہ نہیں چاہتا، اور اللہ تعالی نے وہ
مالم يكن وكان مالم يرد[1]	چیز چاہی جو واقع نہیں ہوئی، اور وہ واقع ہوا
	جس کا اس نے ارادہ نہیں کیا۔
وكل المعتزلة الا الفضيلية اصحاب[2]	اور تمام معتزلہ سوائے فضیلیہ کے جو فضل
فضل الرقاشى يقولون ان الله	الرقاشی کے تبع ہیں۔ کہتے ہیں کہ اللہ تعالے
سبحانه يريد امراً ولا يكون	ایک بات کو چاہتا ہے، اور وہ واقع
وانه يكون مالا يريد[3]	نہیں ہوتی، اور ایسی بات واقع ہوتی ہے۔
	جس کا وہ ارادہ نہیں کرتا۔

ارادۂ باری تعالے کے باب میں جمہور معتزلہ کے ان ہی مذاہب کو (یعنی حدوث ارادہ باری تعالے اور ان الله يريد امراً ولا يكون ويكون مالا يريد) خالدی نے اختیار کیا، اور ان کی تائید

[1] مقالات الاسلامیین ج ۲ ص ۵۱۲ [2] ص ۵۱۲ [3] ایضاً ص ۵۱۴۔

وتثبیت کے لیے ایک کتاب (کتاب ۲۳ مندرجۂ فہرست مکارتھی) لکھی جس کے رد میں امام اشعری نے "النقائض لکتاب الخالدی فی الارادۃ" تصنیف فرمائی۔

مگر مسٹر مکارتھی نے جو ترجمے کیے ہیں، وہ نہ صرف مبہم بلکہ گمراہ کن اور ایک دوسرے کے ساتھ متناقض ہیں۔

۲۴ - الدافع للمہذب :- خالدی کی مہذب کے رد میں[1]۔

مگر اس سے کتاب کا موضوع متعین نہیں ہوتا۔ اصل میں ہے۔

الفنا کتابا نقضنا فیه کتاب الخالدی
فی المقالات سماہ المهذب
سمّینا نقضه فیما خالفه فیه
من کتابه الدافع للمهذب[2]۔

ہم نے ایک کتاب تصنیف کی جس میں
خالدی کی کتاب "المہذب" کا جو اس نے مقالات
میں لکھی تھی، رد کیا ہے، اور اس رد کا نام ہم نے
"الدافع للمہذب" رکھا ہے۔

مقالات سے مراد مختلف فرقوں کے اقوال و مذاہب کی دائرۃ المعارف یا انسائیکلوپیڈیا ہے، جیسے خود امام اشعری کی "مقالات المسلمین" (یا مقالات الاسلامیین واختلاف المصلین نشر کردہ ریٹر) جمل المقالات اور کتاب "مقالات الفلاسفۃ خاصۃ" اسی عہد میں ابو القاسم الکعبی البلخی نے بھی "مقالات" مرتب کی، ادھر امام ابو منصور الماتریدی نے "مقالات" مرتب کی، امام اشعری سے پہلے زرقانی نے مقالات پر کتاب لکھی تھی جس کا حوالہ امام صاحب اکثر مقالات الاسلامیین میں دیتے ہیں، اور لوگوں نے بھی اس موضوع پر کتابیں تصنیف کی تھیں، ان میں سے الخالدی نے بھی ایک کتاب بنام "المہذب" مقالات پر تصنیف کی، امام اشعری نے اس کے جن حصوں سے اختلاف کیا، اس کے رد میں "الدافع للمہذب" لکھی۔

۲۵ - بلخی کی اس کتاب کے رد میں جس میں اس نے ابن الراوندی کی غلطیاں دکھائی ہیں[3]۔

یہ ترجمہ بھی مبہم اور گمراہ کن ہے، اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کون بلخی اور ابن الراوندی کی کونسی کتاب

[1] معارف ص ۲۹۹ سطر ۵ [2] تبیین ص ۱۳۱ سطر ۱۲-۱۳ [3] معارف ص ۲۹۹ سطر ۶

مراد ہے، اصل میں ہے۔

والفنا کتابا نقضنا به علی البلخی
کتابا ذکر انه اصلح به غلط ابن
الراوندی فی الجدل[1]۔

ہم نے البلخی کے خلاف ایک کتاب لکھی جس میں
اس کی اس کتاب کا رد کیا جس کے متعلق
اس نے ذکر کیا کہ اس نے اس میں ابن الراوندی
کی ان غلطیوں کی اصلاح کی ہے، جو اس نے

اوپر ذکر ہو چکا ہے، کہ ابن الراوندی تیسری صدی ہجری کا بہت بڑا ملحد اور جید عالم تھا، ابن خلکان نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

ابو الحسین احمد بن یحیی بن اسحاق
الراوندی العالم المشہور له
مقالة فی علم الکلام وکان من
الفضلاء فی عصره وله من
الکتب المصنفة نحو من مائة
واربعة عشر کتابا[2]۔

ابو الحسین احمد بن یحیی بن اسحاق الراوندی ایک
مشہور عالم تھا، جو علم کلام میں ایک منفرد مذہب
رکھتا تھا، اپنے زمانہ کے فضلاء میں سے تھا،
اس کی مصنفہ کتابوں کی تعداد ایک سو چودہ
کے قریب ہے۔

خود ابو القاسم الکعبی البلخی نے "محاسن خراسان" میں اس کے علم و فضل کے متعلق لکھا ہے۔

قال ابو القاسم الکعبی البلخی فی کتاب
محاسن خراسان ابو الحسین احمد
بن یحیی بن محمد بن اسحاق الراوندی
من اهل مرو الروذ

ابو القاسم الکعبی البلخی نے کتاب محاسن
خراسان میں لکھا ہے، ابو الحسین احمد بن
یحیی بن محمد بن اسحاق الراوندی مرو الروذ کا
رہنے والا تھا، اس کے زمانہ میں اس کے

[1] تبیین، ص ۱۳۱ [2] وفیات الاعیان ابن خلکان۔

ولم یکن فی نظرائہ فی زمنہ احذق	ہم سروں میں کوئی علم کلام کے دقیق اور
منہ بالکلام ولا اعرف بدقیقہ و جلیلہ	جلیل مسائل کا جاننے والا نہ تھا۔

اس ابن الراوندی نے مختلف علوم وفنون پر کتابیں لکھیں، اس ضمن میں اس نے علم الجدل پر بھی ایک کتاب لکھی تھی، جو منطق کی وہ شاخ ہے، جسے یونانی زبان میں طوبیقا (Topica) کہتے تھے، اس موضوع پر بعض متکلمین وفلاسفۂ اسلام مثلاً احمد بن الطیب سرخسی، الفارابی اور خود امام اشعری نے بھی کتابیں لکھی تھیں، ابن الراوندی کی مختلف کتابوں کا رد ابو علی الجبائی، ابو الحسین الخیاط، ابو القاسم البلخی نے کیا، ان میں سے الخیاط کی کتاب "الانتصار" جو اس نے ابن الراوندی کی کتاب "فضیحۃ المعتزلہ" کے رد میں لکھی تھی، نیبرگ کے اعتنا سے چھپ گئی ہے۔

بہرحال ابو القاسم الکعبی البلخی نے ایک کتاب میں ابن الراوندی کی کتاب الجدل کی اغلاط کی اصلاح کی، لیکن یہ اصلاح بجائے خود سقیم تھی، لہذا امام ابو الحسین الاشعری نے اس نام نہاد اصلاح کا رد لکھا اور یہی زیر بحث کتاب ہے۔ (باقی)

سلسلۂ مقالات سلیمان

اسلام اور مستشرقین جلد پنجم

مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک درجن سے زیادہ بلندپایہ تصانیف کے علاوہ بہت سے علمی و مذہبی، فقہی و تاریخی، ادبی و تنقیدی مضامین بھی لکھے تھے جو الندوہ، الہلال اور معارف کے لاتعداد صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ ابھی تک ان مضامین کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں، پہلا تمامتر ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر، دوسرا خالص علمی و تحقیقی مضامین پر، تیسرا قرآن وفقہی مضامین پر مشتمل ہے، چوتھا علامہ کے ادبی معرکۃ الآرا مضامین پر مشتمل ہے جو انھوں نے یورپ و امریکہ کے بعض سرکردہ مستشرقین کے اسلام، شارع اسلام، اور تاریخ اسلام پر اعتراضات کے رد اور مصر کے مشہور عیسائی مورخ و ادیب جرجی زیدان کی کتاب التمدن الاسلامی کے جواب میں لکھے، یہ چوتھا حصہ سلسلہ تالیفات اسلام و مستشرقین میں بھی شامل ہے، جسکی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ اس سلسلہ کا پانچواں حصہ ہے۔

مولانا شبلیؒ بحیثیت مورخ

از- پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ

"یہ مقالہ دارالمصنفین میں مولانا شبلیؒ پر توسیعی لکچر کے سلسلہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی صدارت میں ۱۱ فروری ۱۹۸۶ء کو پڑھا گیا۔" "ض ع"

۱۹۱۳ء کا ذکر ہے۔ علامہ شبلی کی زندگی کا صرف ایک سال باقی رہ گیا تھا، "نقاد" میں ایک مضمون "ملک میں تاریخ کا معلم اول" شائع ہوا۔ اس میں لکھا تھا۔

"شبلی ہم میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے تاریخ و فلسفہ میں ربط باہمی پیدا کیا، اور ان جواہر عقلی کی تحلیل و ترکیب اس طرح کی کہ لٹریچر میں ایک خاص مزاج پیدا ہو گیا ہے"۔

(افادات ہدی- صفحہ ۱۹۱)

مولانا شبلیؒ نے یہ مضمون سن کر کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ شاید ان کی چشم تصور میں اپنی زندگی کے وہ روز و شب گریز پا نظاروں کی طرح گزرنے لگے، جو انھوں نے علم تاریخ کی خدمت میں بسر کئے تھے۔ ممکن ہے انھوں نے یہ شعر اسی کیفیت میں کہا ہو۔

سالہا گوشِ جہاں زمزمہ ناخواہد بود	زیں نواہا کہ دریں گنبدِ گردوں زدہ ام

مولانا شبلیؒ نے صرف تاریخی تصانیف ہی کا بیش بہا ذخیرہ نہیں چھوڑا، انھوں نے تاریخ کا ایک وسیع نظریہ اور تحقیقی اصولوں کے گرانقدر پیمانے بھی ہمیں دئے، عمرانیات کے بنیادی شعور کو تاریخ کی روح سمجھ کر بیدار کیا۔ اور ادبی ذوق اور نفسیاتی بصیرت سے فکر انسانی کو سمجھنے کا کام لیا اور تاریخ کو

واقعات کی کھتیونی کے بجائے، قومی حافظ کی بازیافت کا ذریعہ بنایا۔ قدیم ماخذ سے نئے سوال پوچھے اور اسلامی تاریخ کے ان گوشوں کو منور کر دیا، جہاں ایک مدت سے اندھیرا چھایا ہوا تھا، علامہ شبلیؒ کا نظریۂ تاریخ متحرک، جاندار اور بصیرت افروز عناصر کا مجموعہ تھا، ہندی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ میں ان کے تاریخی ذہن نے جو گرانمایہ خدمت انجام دی ہے، وہ وقت کبھی بھلا نہ سکے گا۔ گذشتہ صدی میں ہندوستان نے کتنے ہی مفکر، مصلح اور عالم پیدا کئے، لیکن شاید ہی کسی کے نام اور کام کو اس طرح زندہ رکھا گیا ہو جیسے شبلیؒ کے کام کو ان کے جانشینوں نے۔ یہ امتیاز نہ سرسیدؒ کو میسر آیا، نہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو۔ دارالمصنفین کو بجا طور پر فخر ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے محسن کو نہیں بھلایا۔

علامہ شبلیؒ نے ایک بیدار ذہن پایا تھا۔ ایسا ذہن جو تمام قیود اور وضعیت سے آزاد ہو کر فکر و عمل کے ہر گوشہ کی تہ تک پہونچنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور ہر خرمنِ کمال سے خوشہ چینی کے لیے تیار رہتا تھا۔ اپنے ایک لیکچر "تعصب اور اسلام" میں کہتے ہیں۔

"اسلام کے پاس جس قدر لٹریچر اس وقت موجود ہے وہ تمام دنیا کے علوم و فنون کا مجموعہ ہے، اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں ہے، جس کے علم کو مسلمانوں نے کمال بے تعصبی سے حاصل نہیں کیا۔" (تعصب اور اسلام، مطبع احمدی علی گڑھ، ص ۱۹)

اس بنیادی نظریہ کے تحت انھوں نے اپنا ذہن ان تمام اثرات کے لئے کھلا رکھا جن سے مشرق و مغرب میں تاریخی تحقیق کی نئی دنیا سجائی جا رہی تھی، اور فکر و نظر کے نئے سانچے ڈھالے جا رہے تھے۔ پرانی روایات۔ وقت کے نئے تقاضوں کے سامنے سرنگوں تھیں، اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاید مشرقی فکر ان بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ نہ دے سکے گی۔

فن تاریخ نویسی میں مولانا شبلیؒ کا سب سے اہم اور عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عربی، ایرانی اور مغربی نظریہ ہائے تاریخ کو ایک فکری وحدت میں ڈھال کر اس طرح پیش کیا کہ

اس میں عربوں کی حقیقت نگاری ایرانیوں کا ذوق ادب اور مغرب کا انداز تحقیق جمع ہو گیا، ہندوستان کا کوئی دوسرا مورخ اس امتیاز میں ان کا شریک نہیں ہے۔

عرب مورخین ایک عہد کی تاریخ لکھتے تھے، اور اس میں ہر قسم کے واقعات کو سنین کے اعتبار سے جمع کرنا ضروری سمجھتے تھے، بادشاہوں کی مداحی یا ان کے نام کتاب کا انتساب عربوں کو سخت ناپسند تھا۔ نابغہ ذبیانی نے سلاطین کی مداحی کی تو تمام عرب اس کو ذلیل سمجھنے لگا۔ (مقالات شبلی ج ۴ ص ۳۱) واقعات کی تحقیق میں عرب مورخین اصول اسناد پر عمل کرتے تھے، بعض اوقات ایک ہی واقعہ کے لئے مختلف اسناد کو رجال کی طویل فہرست کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ یہ انداز اپنی جگہ بے حد اہم تھا، لیکن موثر اس صورت میں ہو سکتا تھا۔ جب اسباب و علل کا رشتہ بھی تلاش کرنے کی سعی کی جاتی، ایران کے تاریخی نظریات تخت و تاج کے گرد گھومتے تھے۔ شاہنامہ تاریخی فکر کا مرکز و محور تھا۔ وہاں صرف شاہی خاندانوں کی تاریخ لکھی جاتی تھی، عوامی زندگی سے مورخ کو کوئی سروکار نہ تھا، چنانچہ ایرانی طرز پر لکھی ہوئی تاریخیں امرا اور سلاطین کی رزم و بزم کی داستانیں ہیں۔ اور ان ہی کے نام ان کا انتساب ہے، اس طرح عرب اور ایرانی نظریہ ہائے تاریخ میں بعد المشرقین تھا۔ مغربی نظریۂ تاریخ جو انیسویں صدی میں پوری طرح نشو و نما پا گیا تھا، یہ تھا کہ تاریخ کو انسان کی حیات اجتماعی کی عکاسی کرنی چاہئے، اس میں سیاست ثقافت، مذہب، ادب، فلسفہ غرض انسانی زندگی اور فکر کے ہر پہلو سے بحث ہونی چاہئے، اور اسے پر عمل کے ساتھ ساتھ واقعات میں سبب اور مسبب کا رشتہ بھی تلاش کرنا چاہئے۔

مولانا شبلیؒ نے ان تینوں نظریوں کو اپنی تنقیدی فکر کی کسوٹی پر پرکھا ان کی خوبیوں اور خامیوں سے واقفیت حاصل کی۔ عالمی تاریخی فکر کے نشو و نما کے جائزہ میں انھوں نے مسلمانوں کے تاریخی اصولوں کی بنیادی اہمیت اور افادیت پر غور کیا۔ اور ان اسباب کو سمجھنے کی کوشش کی جن کے باعث مسلمان اصول اسناد اور اسماء الرجال کو تاریخی تحقیق کے ستون بنا کر آگے نہ بڑھ سکے اور ابن خلدون

جیسا فلسفۂ تاریخ کا ماہر بھی آنے والے مورخین کے طرز تحقیق پر اثر انداز نہ ہو سکا۔ انھوں نے سب تاریخی نظریات پر غور کرنے کے بعد اپنی الگ راہ نکالی اور کھلے ذہن کے ساتھ ہر نظریہ سے فائدہ اٹھایا۔ عربی، ایرانی اور مغربی نظریات کا جو حسین امتزاج مولانا شبلیؒ کے یہاں ملتا ہے، وہ اس عہد کے کسی دوسرے ہندوستانی مورخ کو نصیب نہیں ہوا۔

تاریخی ذوق اور فکر کا نشوونما | مولانا شبلیؒ کے تاریخی ذوق اور ان کے نظریات تاریخ کے نشوونما میں چار اثرات بہت واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

(۱) سرسید (۲) آرنلڈ (۳) بلگرامی اور (۴) سفر ترکی۔

مولانا شبلیؒ کے افکار میں حرکت ان ہی کے ذریعہ پیدا ہوئی۔ اور تلاش و جستجو کی نئی راہیں کھلتی چلی گئیں۔

سرسید کے علی گڑھ میں اس وقت کی علمی اور ادبی تحریکوں کا دل دھڑکتا تھا۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد "جدید ہندوستان کے بہترین مسلمان مصنف ان ہی کے زیر اثر پیدا ہوئے اور یہیں نئے قسم کی اسلامی تحقیق و تصنیف کی راہیں پہلے پہل کھولی گئیں" (کانووکیشن ایڈریس۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۹ء صفحہ ۲۰۰) سرسید کے علمی روابط کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا۔ جس کی بنا پر اسلامی کتب کا بہترین ذخیرہ ان کے کتب خانہ میں جمع ہو گیا تھا۔ سرسید نے اس علمی خزانہ کا منھ مولانا شبلیؒ کی علمی جستجو کے لئے کھول دیا تھا۔ ایک خط میں اس کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں۔

"سید صاحب نے اپنے کتب خانہ کی عام اجازت مجھ کو دیدی ہے، اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت موقع حاصل ہے۔ سید صاحب کے پاس تاریخ، جغرافیہ، عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں، جن کو حقیقت میں میں کیا، بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے مگر سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں ....

مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں ہوئیں۔"

مولانا شبلیؒ کے تاریخی ذوق کی بنیاد اسی کتب خانہ میں رکھی گئی۔

سرسید نے اپنی کوٹھی کے قریب ایک بنگلہ میں ان کے قیام کا انتظام کر دیا تھا۔ اس طرح ابتدائی زمانہ میں ہی ان کو ایک نایاب علمی ذخیرہ میں اپنے روز و شب گزارنے اور اس سے استفادہ کرنے کا موقع مل گیا۔ اس ماحول نے ان کے ابتدائی علمی ذوق کا رخ بدل دیا۔ فقہی موشگافیوں کی جگہ تاریخی تحقیق نے لے لی۔ اور رفتہ رفتہ یہ کیفیت ہو گئی کہ انھوں نے اپنے ادبی ذوق، کلامی بصیرت، اور فلسفیانہ تیز نگاہی کو تاریخ ہی کی چاکری میں لگا دیا۔ مولانا اقبال سہیل کا بیان ہے کہ "علی گڑھ میں مولانا کا موضوع تصنیف بدل گیا۔ اگر وہ اسی قدیم ماحول میں رہتے تو درسیات کے شروح و حواشی یا فروعیات فقہی کے تنگ دائرہ سے نکلنا شاید نصیب نہ ہوتا۔ یہاں آئے تو اسلامی تاریخ کے ناپیدا کنار میدان میں تگ و دو کا ولولہ پیدا ہوا۔"

پھر دوسری اہم علمی صحبت جو علی گڑھ میں مولانا شبلیؒ کو میسر آئی وہ پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ کی تھی۔ آرنلڈ کو اسلامی تاریخ اور تمدن سے گہری دلچسپی تھی۔ اعلیٰ علمی مذاق کے ساتھ ساتھ مذہبی رواداری اور بے تعصبی کا جذبہ بھی بدرجۂ اتم تھا۔ مولانا شبلیؒ کے لئے ان کی حیثیت فرینڈ، فلاسفر اور گائڈ کی ہو گئی تھی۔ خود کہتے ہیں۔

آرنلڈ آں کہ رفیق است و ہم استاد مرا

نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صدر یار جنگ کا بیان ہے۔

"بڑی خوش قسمتی علامہ شبلیؒ کی یہ تھی کہ اس عہد میں پروفیسر آرنلڈ ایسا علم دوست استاد کالج میں موجود تھا۔ یہ دونوں دلدادگانِ علم باہم ملے اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللون نور کی شعاعیں باہم مل کر عالم کی روشنی کا باعث بنتی ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ نے علامہ کو جدید

اصول سے آگاہ کیا۔

یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز و سامان ہیں۔ قدیم علوم پر کیا کیا اعتراض اور حملے ہیں۔
علامہ شبلیؒ کی صداقت اور قوت دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب
نہیں ہوئے۔ بلکہ ان پر اطمینان سے غور کیا جو اصول عمدہ تھے ان کو اخذ کیا بلکہ ان کو اپنی
زندگی کا رہبر بنایا"۔

شمس العلماء سید علی بلگرامی بھی علوم اسلامی پر گہری نظر رکھتے تھے، اور یورپین زبانوں سے واقفیت
کی بنا پر فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں جو لٹریچر اسلام پر شائع ہوا ہے، اس تک ان کی دسترس تھی انھوں
نے علامہ شبلیؒ کے لیے بعض مضامین جرمن زبان سے اردو میں ترجمہ کئے اور جدید تاریخی رجحانات سے باخبر کیا،
مغربی تعصب اور تنگ نظری نے تاریخ اسلام کے ساتھ جو نا انصافی کی تھی۔ اس کی تہ تک پہونچے بغیر،
کوئی علمی کام موثر نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ اور نہ اس نئی نسل کی تشنگی دور ہو سکتی تھی جو مغربی افرات و
نظریات سے قریب ہوتی جا رہی تھی، آرنلڈ اور بلگرامی نے شبلیؒ کو مغرب کے انداز تحقیق ہی سے نہیں بلکہ
اس کی پیدا کی ہوئی غلط فہمیوں سے بھی آگاہ کیا۔ شبلیؒ کو اپنے علمی کاروان کے لئے جس رخت سفر کی
ضرورت تھی، اور جن منزلوں سے گزرنا تھا، اس کا اندازہ اپنے ابتدائی دور میں ہی ان کو ہو گیا تھا۔
اور ان کی نظر فوراً معاملہ کی تہ تک پہونچ جاتی تھی۔ جرجی زیدان کی تصانیف میں جو زہر ملا ہوا تھا اس کو
سب سے پہلے ان کی عالمانہ بصیرت نے محسوس کیا۔

پھر ترکی کے سفر نے مولانا شبلیؒ کا ذہنی افق بہت وسیع کر دیا۔ جو جذبہ اس سفر کا محرک ہوا تھا۔ وہ
سیر و سیاحت کا نہ تھا۔ بلکہ تاریخ کا ذوق ان کو کشاں کشاں لے گیا۔ سفر نامہ میں لکھتے ہیں،۔

"جس زمانہ میں مجھ کو ہیروز آف اسلام کا خیال پیدا ہوا اسی وقت یہ خیال بھی آیا
کہ ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے۔ وہ اس مقصد کے لیے کسی طرح کافی نہیں

ہو سکتا۔ یہی خیال تھا جس نے اول اول اس سفر کی تحریک دل میں پیدا کی (سفرنامہ ص۱)

ترکی کے سفر میں شبلیؒ کے تاریخی ذہن کی مزید جلا ہو گئی۔ بعض اہم تاریخی اور جغرافیائی اسباب کی بنا پر یورپ
کی تاریخی سرگرمیوں اور اسلام کے ساتھ اس کے معاندانہ طرز عمل کا براہ راست علم اور تجربہ ترکی ہی کو تھا،
شبلیؒ نے جن تاریخی اصولوں کے متعلق اب تک صرف سنا ہی تھا۔ ان کو عملی طور پر یہاں بروئے کار دیکھا۔
اور ترکوں کے رد عمل کا جائزہ لیا۔ یہاں انھوں نے ان غلطیوں پر رد و قدح سنی جو اسلامی تاریخ کے
سلسلہ میں یورپین مصنفین نے کی ہیں۔ (ص ۹۴)، ترکی زبان میں تاریخی سرمایہ سے مولانا شبلیؒ بہت متاثر ہوئے۔
اور یہ محسوس کیا کہ عربی زبان کے بعد ایشیا کی کسی زبان میں اتنا تاریخی سرمایہ نہیں ہے جتنا ترکی میں، لکھتے ہیں
بلکہ ایک لحاظ سے اس کو عربی پر ترجیح حاصل ہے۔ عربی زبان میں جس قدر تاریخیں ہیں سادہ واقعات
کا مجموعہ ہیں۔ اور جس قدر کوشش و اہتمام ہے صرف اصول روایت کے متعلق ہے۔ بخلاف اس کے ترکی
تاریخیں ان اصول و قواعد کے مطابق لکھی جاتی ہیں، جو فلسفہ تاریخ کے اصول ہیں۔ اور جس کی بنا پر یورپ
نے اس فن کو معراج کمال تک پہونچا دیا ہے"۔ شبلی نے وہاں تاریخ کی درسی کتابوں کو بھی بغور دیکھا۔
ان کو یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ تمام واقعات میں علت و اسباب کا سلسلہ ملحوظ رکھا ہے۔ اور جا بجا محاکمہ
اور تحقیق و تنقید کی گئی ہے، اس کے ساتھ ہر عہد حکومت کے خاتمہ پر اس عہد کی تمدنی، اخلاقی، علمی،
حالت تفصیل کے ساتھ دکھائی ہے۔ (صفحہ ۴، ۳)، پھر اس سفر میں ان کو عربی کی ایسی نایاب اور
مستند کتابوں سے بھی واقفیت حاصل ہوئی جو "قسطنطنیہ کے سوا اور کہیں نصیب نہیں ہو سکتی تھیں"
(صفحہ ۴)، ترکی مورخین کے انداز تحقیق کو بھی سراہا۔ قضاۃ کے حالات میں کتابیں دیکھ کر خیال اس طرف
گیا کہ اگر حالات زندگی کے ساتھ ان کے احکام اور فیصلے بھی نقل کئے جائیں تو آج کے طریقہ انفصال مقدمات
کے ساتھ اس کا موازنہ کیا جا سکے۔ لکھتے ہیں کہ یورپ کی تصنیفات حال کے سوا اس طرز کی تصنیف کا
کہیں پتہ نہیں لگتا"۔ (صفحہ ۸)، اگر علماء و فقہا کے حالات زندگی کے سلسلہ میں مولانا شبلیؒ کے

اس مشورے پر عمل ہو جاتا تو اسلامی فقہ کی تاریخ میں بڑی بصیرت اور دلکشی پیدا ہو جاتی۔

عاشر آفندی کے کتب خانہ میں مضامین شعری کی تاریخ پر ایک کتاب علامہ شبلیؒ کی نظر سے گذری (صفحہ ۸۰) اس سے شعر و ادب کی تاریخ کے بنیادی خطوط ذہن میں اُبھر آئے اور شعر العجم کی فکری بنیاد ترکی میں پڑی۔ شبلیؒ کی جودت طبع، تابندگی فکر، اور اخذ و استنباط کی غیر معمولی قدرت نے ان تمام علمی تجربات اور معلومات کو ایک متحرک اور موثر نظریۂ تاریخ میں ڈھالدیا۔

ہندوستانی تاریخ کے انگریز مصنف

پھر ایک اور صورت حال جو مولانا شبلیؒ کے لئے ذہنی بے چینی کا سبب بنی انگریز مصنفین کی وہ کتابیں تھیں جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ بالخصوص اسلامی عہد کے متعلق لکھی تھیں۔ ۱۸۱۳ء میں Charles Grant کی مشہور کتاب

Observation on the state of society among the Asiatic subjects of Great Britain, particulary with respect to morals

شائع ہوئی جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو ہدف ملامت بنایا گیا تھا۔ اور ہندوستانیوں کے اخلاق و اطوار کو بہیمانہ بتایا گیا تھا۔ ۱۸۱۸ء میں مل James Mill کی کتاب History of British India شائع ہوئی اور میکالے نے House of Commons میں اس کتاب کو گبن کی مشہور تاریخ کے بعد انگریزوں کا سب سے شاندار تاریخی کارنامہ قرار دیا۔ مل نے نہایت چابک دستی کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے سماجی نظام کے اختلافی پہلوؤں کو اُجاگر کیا تاکہ اتحاد و یک جہتی کی راہیں مسدود ہو جائیں۔ ۱۸۳۰ء میں گلیگ George Robert Gleig کی British Empire اور ۱۸۴۱ء میں الفنسٹن (Elphinstone) کی تاریخ شائع ہوئی۔ اور انگریزی سامراجی تقاضے تاریخ کو مسخ کرنے میں

کامیاب ہوتے نظر آنے لگے۔ یہ کتابیں تو اپنی جگہ تھیں ہی کہ ۱۸۶۷ء میں سرہنری ایلیٹ Sir Henry Elliot کی مشہور تاریخ ۸ جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس تاریخ میں خود مسلمانوں کی عربی اور فارسی تاریخوں سے مواد اس طرح اخذ کیا گیا تھا کہ اختلاف، جنگ و جدل، ظلم و تعدی کی داستانوں کو اسلامی ہند کی تاریخ میں مرکزی حیثیت حاصل ہو جائے۔ عجیب اتفاق یہ تھا کہ ایلیٹ نے اس کتاب کے سلسلہ میں اپنی حکومت کو جو درخواست پیش کی تھی۔ اور یہ بتایا تھا کہ اس کے شائع ہونے کے بعد ہندوستانیوں میں اختلاف کے سوتے پھوٹ پڑیں گے۔ وہ بھی اس میں بطور مقدمہ شامل کر لیا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایلیٹ کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی حکومت کی برتری اور برکتیں اس طرح محسوس کرائے کہ اسلامی عہد ان کو تاریک نظر آنے لگے۔ انگریزی حکومت کا حال تابناک اسی وقت ہو سکتا تھا۔ جب اسلامی حکومت کا ماضی سیاہ پس منظر کا کام انجام دے۔

ممکن نہ تھا کہ شبلیؒ کی حساس فطرت اس منظم تاریخی سازش کے خلاف برانگیختہ نہ ہوتی۔ ان کی دور بین نگاہوں نے ان کتابوں سے پیدا ہونے والے اثرات کو سمجھ لیا تھا۔ اور نہایت کرب کے عالم میں پکار اٹھے تھے۔ ؎

تمھیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

ہندوستان میں اسلامی عہد کی تاریخ کو غلط فہمیوں کے کہرے سے نکالنے میں جن مفکرین نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، اُن میں مولانا شبلیؒ کا نام ہمیشہ احترام سے لیا جائے گا۔

۸ فروری ۱۹۱۰ء کو ایک خط میں نواب صدر یار جنگ کو لکھتے ہیں: "لوگ اکبری یا عالمگیری ہیں، لیکن میں جہانگیری ہوں"۔ (مکاتیب شبلی حصہ اول۔ صفحہ ۱۸۶) اس ایک مختصر جملہ میں انھوں نے تاریخ ہند سے متعلق اپنے مسلک کی پوری وضاحت کر دی ہے۔

مشرق کے تاریخی سرمایہ کا جائزہ

اسلامی تاریخی سرمایہ کو مولانا شبلیؒ نے جس نظر سے دیکھا، اور اس کے

متعلق جو رائے قائم کی، اس کا تجزیہ ان کی تاریخی فکر کو سمجھنے کے لیے ازبس ضروری ہے، مولانا شبلیؒ کا خیال تھا کہ عرب میں جب تمدن کا آغاز ہوا۔ تو سب سے پہلے تاریخی تصنیفات وجود میں آئیں۔ یہ حقیقت عربوں کے انداز فکر کی آئینہ دار ہے۔ اور فن تاریخ میں ان کی دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے، تاریخ سے دلچسپی عربوں کے خمیر میں تھی۔

مولانا شبلیؒ چار عرب مورخین کی مورخانہ بصیرت اور وسعت معلومات کے قائل تھے۔

مسعودی، ابن مسکویہ، ابن خلدون، علامہ مقریزی،

ابو الحسن علی بن حسین مسعودی (م ۹۵۶ء) کو وہ فن تاریخ کا امام قرار دیتے تھے، ان کا خیال تھا کہ "اسلام میں آج تک اس کے برابر وسیع النظر مورخ پیدا نہیں ہوا۔ (الفاروق۔ صفحہ ۸) ان کی نظر میں، اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ دنیا کی اور قوموں کی تواریخ کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اس کی تمام تاریخیں ملتیں تو کسی اور تصنیف کی کچھ حاجت نہ ہوتی، لیکن افسوس ہے کہ قوم کی بدمذاقی سے اس کی اکثر تصنیفات ناپید ہو گئیں۔ یورپ نے بڑی تلاش سے دو کتابیں مہیا کیں، ایک مروج الذہب اور دوسری کتاب الاشراف والتنبیہ" (ایضاً صفحہ ۹ - ۸)

ابن مسکویہ (م ۱۰۳۰ء) کی تاریخی فکر کی بھی مولانا شبلیؒ بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کو اس کی خوشی تھی کہ وہ واقعات میں علت و معلول کا رشتہ قائم کرنے کو ضروری سمجھتا ہے۔ اس نے انبیاء کے حالات میں معجزات کے بجائے وہ واقعات لکھے ہیں۔ جو انبیاء سے انسانی تدبیر کی حیثیت سے وقوع میں آئے ہیں۔ اور جن سے انسان کو رہبری حاصل ہو سکتی ہے۔ (مقالات ج ۴ صفحہ ۲۵) مولانا شبلیؒ نے ابن مسکویہ اور فردوسی کے بیانات کے تضاد کو بھی بیان کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ

"ان واقعات کے متعلق یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ابن مسکویہ اور فردوسی دونوں میں سے کس کا بیان صحیح ہے۔ لیکن مجھ سے پوچھا جائے تو میں فردوسی کو ایران کی تاریخ کا

زیادہ حق دار سمجھتا ہوں۔"

(مقالات شبلی جلد ۴ صفحہ ۲۰)

ابن خلدون (م ۱۴۰۶ء) کا مولانا نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ کہا کرتے تھے کہ اس نے درایت کے اصول نہایت نکتہ سنجی اور باریک بینی کے ساتھ مرتب کئے ہیں (الفاروق۔ صفحہ ۱۴) ابن خلدون نے تاریخ میں جن غلطیوں کے امکان پر گفتگو کی ہے وہ یہ ہیں۔

۱ کسی عقیدہ یا مکتب فکر سے وابستگی

۲ اپنے ماخذ پر ضرورت سے زیادہ اعتماد

۳ حقیقی مقصد تک پہونچنے میں ناکامی

۴ غلط چیز پر یقین پیدا ہو جانا

۵ واقعات کو ان کے صحیح پس منظر میں نہ دیکھ سکنا۔

۶ ذی مرتبہ لوگوں کی خوشنودی اور اعتماد حاصل کرنے کی خواہش

۷ انسانی معاشرہ میں تبدیلی پیدا کرنے والے قوانین سے بے خبری

۸ مبالغہ آرائی کی طرف طبیعت کا رجحان

ابن خلدون نے گو واقعات طبری، مسعودی، واقدی سے حاصل کئے ہیں۔ لیکن ترتیب و استنباط اس کی جودت فکر کا نتیجہ ہے۔ اس نے جرح و تعدیل کے اصول بڑی محنت سے وضع کئے تھے، لیکن مولانا کی نظر ایک اور حقیقت کی طرف بھی گئی۔ اور وہ یہ

"اس کو اس قدر فرصت نہ ملی کہ اپنی تاریخ میں ان اصولوں سے کام لے سکتا"

(الفاروق۔ صفحہ ۱۲)

مولانا شبلیؒ ابن خلدون کے شاگرد علامہ مقریزی (م ۱۴۴۲ء) کی تاریخی بصیرت کے بھی قائل تھے۔

مولانا شبلیؒ کو ابن الاثیر، سمعانی، ذہبی، ابو الفدا، سیوطی وغیرہ سے شکایت تھی کہ انھوں نے شہرت توبہت حاصل کی، لیکن "تاریخ کے ساتھ من حیث الفن کوئی احسان نہیں کیا۔ قدما کی جو خصوصیات تھیں، لکھ دیں اور خود کوئی نئی بات نہیں پیدا کی" (الفاروق۔ صفحہ ۹) انھوں نے خاص طور پر متاخرین کے اس طرز پر تنقید کی ہے۔ کہ وہ کوئی قدیم تصنیف سامنے رکھ لیتے ہیں۔ اور بغیر اس کے کہ اس پر کوئی اضافہ کرسکیں، تغیر اور اختصار کے ساتھ اس کا قالب بدل دیتے ہیں۔ (صفحہ ۹) لکھتے ہیں کہ قدما میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ "وہ تمام واقعات کو حدیث کی طرح سند متصل نقل کرتے تھے۔ متاخرین نے یہ التزام بالکل چھوڑ دیا" (صفحہ ۱۰-۹) اس طرح وہ عظیم الشان آلات تحقیق جن سے نہایت دورس نتائج مرتب ہوسکتے تھے۔ ان کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ زمانہ حال کے ایک مورخ ہٹی (Hitti) نے اصول اسناد اور اسماء الرجال کے متعلق لکھا ہے کہ یہ دونوں اصول جدید علم تاریخ کے بنیادی مطالبات کو پورا کرتے ہیں۔

مولانا شبلیؒ کا خیال تھا۔ اگر ان دونوں اصولوں پر مسلمان مورخ عمل پیرا رہتے تو فن تاریخ میں ان کی حیثیت ہمیشہ امتیازی رہتی۔

مولانا شبلیؒ کا خیال تھا کہ تاریخ کے لیے دو باتیں بالکل لازمی ہیں۔ ان کے بغیر تاریخ کا تصور ہی مکمل نہیں ہوسکتا۔

۱۔ تمدن، معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب ہر چیز کے متعلق واقعات قلمبند کرنا۔

۲۔ واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کرنا۔ (صفحہ ۱۱)

ان کا خیال تھا کہ کل ایشیائی تاریخوں میں یہ دونوں چیزیں مفقود ہیں۔ "تاریخیں فرمانرواؤں کی جنگوں کی داستانیں ہیں۔ اور چونکہ اس زمانہ میں قانون اور قاعدہ جو کچھ تھا۔ بادشاہ کی زبان تھی۔ اس لیے سلطنت کے اصول اور آئین کا بیان کرنا بھی گویا بے فائدہ تھا۔" (صفحہ ۱۱)

اسباب، عقل پر بحث و گفتگو نہ کرنے کے نتائج .... کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہی وجہ ہے کہ احادیث و سیر میں روایت کا پلہ ہمیشہ درایت سے بھاری رہا، بلکہ انصاف یہ ہے کہ درایت سے جس قدر کام لیا گیا نہ لئے جانے کے برابر تھا" (صفحہ ۱۲)

مسلمانوں میں جب علمی انحطاط کا سلسلہ شروع ہوگیا تو پھر کسی کا اس طرف خیال بھی نہ گیا۔ کہ انھوں نے کیا کھودیا۔ اگر تاریخ کا فن ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا ہوتا، جو تاریخ کے ساتھ فن جنگ، اصول قانون، اصول سیاست، علم الاخلاق سے بھی آشنا ہوتے تو آج یہ فن کہاں سے کہاں پہونچا ہوتا۔ (صفحہ ۱۳) مشرقی تاریخی روایات اور سرمایہ کے اس تجزیہ میں بڑی بصیرت اور معروضیت کارفرما ہے۔

مغربی اثرات | مولانا شبلیؒ باوجود زبان کی دشواریوں کے مغربی تاریخی نظریات سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ جرمن اور فرنچ زبانوں میں کافی تاریخی سرمایہ تھا۔ اور وہاں تحقیقی نظریات بھی نہایت تیزی سے بنتے اور بدلتے رہتے تھے۔ مولانا شبلیؒ نے فرنچ زبان بقدر ضرورت سیکھ لی تھی۔ خود لکھتے ہیں۔

"فرنچ تصنیفات کے متعلق مجھ کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ میں نے ٹوٹی پھوٹی فرنچ سیکھ لی ہے۔ اور اس لئے اون سے متمتع ہونا میرے لیے چنداں دشوار نہ تھا" (کتبخانہ اسکندریہ صفحہ")

جرمن زبان کے بعض مضامین کے ترجمے شمس العلماء سید علی بلگرامی سے کرائے۔ اور ان کے طرز تحقیق اور ماخذ کے استعمال کے متعلق اپنی رائے قائم کی۔

مغربی مورخین میں جن کے نظریات کو انھوں نے سمجھنے کی کوشش کی ان میں گبن مصنف Decline and fall of the Roman Empire کارلائل مصنف On Heroes and Hero Worship خاص طور پر قابل ذکر ہیں، علاوہ ازیں انھوں نے (Van Ludaf Krell اور Ranke) Buckle, Taine کے خیالات وانکار سے بھی آگاہی حاصل کی نیز انھوں نے (Hegel, Comte) کے خیالات سے بھی واقفیت کا اظہار کیا ہے۔

گبن کی تاریخ کے سرسید بہت مداح تھے۔ مولانا شبلی ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"گبن صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپیہ کے خرچ سے کرایا ہے، میرے مطالعہ میں ہے"

کارلائل کی کتاب انھوں نے عربی ترجمہ میں پڑھی تھی۔ C.H.Philips Histori-ans of India Pakistan and Ceylon- p 487

کارلائل عظیم شخصیتوں کے اثرات کو تاریخ میں خاص اہمیت دیتا تھا۔ اس کا تصور تاریخ، افراد کی سوانح حیات کے گرد گھومتا تھا۔

مغرب میں علم تاریخ کے نشوونما میں انیسویں صدی کو خاص اہمیت حاصل ہے گوچ (Gooch) نے اس کو "تاریخی فکر کا عہد زریں" Goldenage of historical thinking قرار دیا ہے۔

اس زمانہ میں فرانس جرمنی اور انگلستان میں ایسے مورخین پیدا ہوئے جنھوں نے تاریخی نظریوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ Leopold Ranke نے ایک طرف ماخذ کے عمیق اور بغور مطالعہ کی اہمیت پر زور دیا۔ اور کہا۔

'The strict presentation of the facts contingent and unattractive though they may be, is undoubtedly the supreme law' Trygoe R.Tholfsen, Historical Thinking p 160

دوسری طرف اس نے مورخ کے لئے انسانی زندگی کی روحانی، زندگی بخش اور تخلیقی قوتوں spiritual, life-giving, creative forces کا مطالعہ ضروری قرار دیا۔ p.166

گبن، کارلائل، رینکے، کی فکر کے مثبت پہلوؤں کو مولانا شبلی نے قبول کیا۔ اور ان کو اپنے

نظریات کے سانچے میں ڈھال کر ایک دلکش صورت دیدی۔ گبن کا تاریخی ذہن، اور انداز بیان، رینکے کا تلاش ماخذ اور اُن میں ربط پیدا کرنے کی کوشش، اور کارلائل کا Hero کا نظریہ — مولانا شبلی کے تاریخی فکر میں اس کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ بعض موقعوں پر ان کے ذہن نے جس طرح وسیع پس منظر میں سیاسی واقعات کا تجزیہ کیا ہے، اسے پڑھ کر بے اختیار گبن کا انداز بیان نظروں کے سامنے آجاتا ہے، شبلی کا Royal Heroes of Islam کا تصور کارلائل سے متاثر ہے، مذہبی تحریکوں کو سمجھنے کی کوشش، رینکے کی فکر سے ہم آہنگ ہے۔ لیکن یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ انھوں نے کوئی خارجی تجزبہ قبول نہیں کیا بلکہ اس کو اپنی فکر کے سانچے میں ڈھال کر ایک نیا روپ اور رنگ دیا۔ کارلائل کے تصور ابطال کو حیات اجتماعی کے پس منظر میں پیش کر کے وہ بالکل دوسری سطح پر پہنچ گئے۔ سیرۃ النبی کے سلسلہ میں یورپ کے مصنفین کی تصانیف کو انھوں نے جمع کیا تھا، ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"سیرۃ نبوی جو زیر تصنیف ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آنحضرت صلعم کے متعلق لکھا ہے۔ اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے۔ تاکہ ان کے تائیدی بیان حسب موقع حجت اسلامی کے طور پر پیش کئے جائیں۔ اور جہاں انھوں نے غلطیاں اور بددیانتیاں کی ہیں نہایت زور و قوت کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے۔" (مکاتیب شبلی۔ حصہ اول صفحہ ۲۳۸-۲۳۱)

انھوں نے پروفیسر عبدالقادر کو شعر العجم حصہ چہارم کے متعلق لکھا تھا کہ انگریزی میں صوفیانہ یا رزمیہ شاعری پر ریویو ہو تو اس کا ترجمہ ان کو بھیجیں۔ (مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ ۲۳۴) جب یہ حصہ تیار ہو گیا تو پوری خود اعتمادی کے ساتھ لکھا۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں ہو تو البتہ یورپ کو نظر آئے کہ کیا چیز ہے۔" (مکاتیب - صفحہ ۲۳۶) براؤن کی Literary History of Persia کا مطالعہ کرنے کے بعد جو رائے قائم کی وہ یہ تھی۔

"بلا مبالغہ اور بلا تصنع کہتا ہوں کہ براؤن کی کتاب دیکھ کر سخت افسوس ہوا۔

نہایت عامیانہ اور سوقیانہ ہے۔"

مولانا شبلیؒ مغربی طمطراق سے کبھی متاثر نہیں ہوئے گو ان کا ذہن ہر نئے اثر کے لئے کھلا رہا۔

جدید فن تاریخ کے اہم اصول | موجودہ دور میں فن تاریخ نے چار پہلوؤں کو خاص طور پر اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔

دریافت ماخذ	Heuristics
تنقید	Criticism
تطبیق	Synthesis
انداز بیان	Exposition

اور ان ہی کے گرد مورخ کی ساری ذمہ داریاں مرکوز کردی گئی ہیں۔ Heuristics کا ماخذ و منابع کی دریافت سے متعلق ہے۔

جب تاریخ کا دائرہ شاہی خاندانوں تک محدود نہ رہا بلکہ اس میں انسانی فکر و عمل کا ہر گوشہ داخل ہو گیا، تو پھر نئے ذرائع معلومات کی تلاش بھی ضروری ہو گئی۔ پھر اس مواد کی تاریخی اہمیت کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنا، اور اس میں قابل اعتبار اور غیر معتبر شہادتوں کو علٰحدہ کرنا، اور ذہنی اور اخلاقی پس منظر کا جائزہ لے کر آگے بڑھنا، یہ سب چیزیں ماخذ کی تنقید کے لئے ضروری قرار دی گئیں۔ اس تاریخی مواد کو اسباب و علل کے رشتہ میں پرو کر ایک واضح شکل میں پیش کرنا، اور غیر مربوط معلومات میں ربط اور تسلسل پیدا کرنا مورخ کا فرض شمار ہونے لگا۔ آخر میں اس پورے عمل Process سے گزر کر ایسا انداز بیان اختیار کرنا، جو موثر بھی ہو اور جچا تلا (Exact) بھی۔ کسی مورخ کی کامیابی یا ناکامی کا اندازہ موجودہ دور میں ان ہی پیمانوں سے کیا جاتا ہے۔

مولانا شبلیؒ آج بھی ان اصولوں پر پورے اترتے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے تاریخی ذہن نے

جو اصول تحقیق و تنقید اپنے لیے وضع کیے تھے، وہ آج بھی اپنی جگہ صحیح اور موثر ہیں جتنے ۷۰، ۸۰ سال قبل تھے۔ گو تاریخی تحقیق کے نئے زاویے، مثلاً اعداد و شمار پر زور Quantification of data اور تاریخی عوامل میں نفسیاتی اثرات کی کارفرمائی psycho-history وغیرہ وجود میں آگئے ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ شبلیؒ نے سیرۃ النبیؐ اور الفاروق کے مقدموں میں جن تحقیقی اصولوں کو بیان کیا ہے، ان کی اہمیت اور افادیت آج بھی مسلم ہے۔ وہ درایت اور اسباب و علل کو تاریخ کی جان سمجھتے تھے کون کہہ سکتا ہے کہ جدید تاریخی تحقیق ان سے صرف نظر کر سکتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے سامنے اسباب و علل کی تلاش کے پیمانے نہیں تھے۔ جو بعد کو Dialectical-Materialism یا اور دوسرے نظریات تاریخ کی شکل میں تاریخی فکر کو مقید اور محدود کر رہے ہیں۔ مولانا شبلیؒ نے سیرت پاک اور خلفائے راشدین کے حالات کے تجزیہ میں بھی کسی جذباتی یا روایتی پیمانے کو قبول نہیں کیا۔ بلکہ ابن مسکویہ کی طرح انسانی تدبیر کی روشنی میں حالات کو سمجھنے کی کوشش کی جن مصنفین نے شبلیؒ کو مذہبی مورخ کہہ کر ان کے علمی کارناموں کی اہمیت کم کرنی چاہی ہے، ان کو اس پہلو پر دیانت داری سے غور کرنا چاہئے۔ جو شخص عالم دین ہوتے ہوئے، سیرۃ النبیؐ کی تالیف اس اعلان کے ساتھ کرنے کا عزم کرے کہ تیرہ سو سال کی وسیع مدت میں ایک کتاب بھی اس فن سیرت، میں ایسی تصنیف نہیں کی گئی جس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا . . . . . محدثین نے تنقید و تحقیق کی ضرورت کو احادیث احکام کے ساتھ خاص کر دیا ہے۔"

اس کی تاریخی دیانت داری، معروضیت اور تحقیقی جستجو کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ بالخصوص جب نزہۃ الخواطر کا بیان ہے (جلد ۵ صفحہ ۱۰۴)، کہ آداب و اقوام و ملل و فلسفہ اخلاق کے موضوع پر کوئی کتاب مشکل سے ان کی نظر سے بچی ہوگی۔

سرسید نے آثار الصنادید لکھ کر تاریخی جستجو کے دائرے وسیع کر دیے تھے، شبلی نے اس کو ایک تاریخی روایت میں تبدیل کیا۔ اور تاریخ کو شاہی خاندانوں کی رزم و بزم کی داستان بننے سے بچا لیا، انھوں نے

علم و ادب، اخلاق و مذہب، فن و ہنر سب کو تاریخ کے دائرہ میں شامل کیا۔ مدرسوں کی تاریخ، نصاب تعلیم کے تجزیے کو ذہنی تاریخ کے سمجھنے کے لئے لازمی قرار دیا۔ جبر و مقابلہ، فن طب، آلاتِ عیون، شفاخانوں، میکنکس، ہر طرف اس لئے توجہ کی کہ ان سے ثقافتی اور تمدنی زندگی کے گوشے روشن ہوتے تھے۔ جب بلاغات النساء اُن کے مطالعہ میں آئی جس میں عورتوں کی تقریریں اور خطبے جمع کئے گئے ہیں تو بے اختیار پکار اٹھے۔

"قدما کی تصانیف کی گم شدگی کی وجہ سے اسلامی تمدن، اسلامی اخلاق بلکہ خود شریعت اسلام کی جو تصویر ہمارے پیش نظر ہے، اس قدر اصلیت سے دور ہے کہ صحیح خد و خال کا تصور کرنا بھی آج مشکل ہے۔" (مقالات۔ جلد ۴ صفحہ ۱۳)

جب پرنسپل بیک نے گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ کے متعلق مولانا سے پوچھا تو چونکہ کتاب ان کے علم میں نہیں تھی، اس لئے لکھتے ہیں:۔

"مجھ کو اپنی تاریخ دانی پر ناز تھا۔ میرے غرور کو توڑنے کے لیے یہ کچھ کم بات نہ تھی کہ میں ہمایوں نامہ تو ایک طرف سرے سے گلبدن بیگم ہی کو نہیں جانتا تھا۔ (مقالات۔ جلد ۴ صفحہ ۵۴)

پھر ہمایوں نامہ پر مضمون لکھا تو مغل بیگمات کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر بنا دی۔

مولانا شبلی کے ذہن کا جائزہ اگر ممکن ہوتا تو پتہ چلتا کہ تاریخ اسلام کے کتنے گوشوں پہ کام کرنے اور ان کو اسلامی تہذیب و ثقافت کے وسیع چوکھٹے میں سجانے کی آرزو ان کے دل کو بے چین کئے ہوئے تھی وقت کم تھا۔ اور کام بہت۔ صحت پکارتی تھی۔ ع جو کرنا ہے کر لو کہ تھوڑی ہے مدت۔

انھوں نے تحقیق کے ہر گوشہ میں قدم رکھا، جستجو کا قدم آگے بڑھانا چاہا، لیکن پھر دامن دل کسی اور طرف کھنچ گیا۔ اُن کے علم الکلام، الکلام، الغزالی، سوانح مولانا روم نے اسلامی فکر کی جو مسلسل تاریخ پیش کر دی ہے وہ تمدن اسلام کے مورخین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی ہے۔ ان کی تصانیف اور مضامین کا اگر فکری تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ تاریخ ترتیب قرآن سے لے کر علوم اسلام کے زوال و انحطاط تک

اسلامی علوم و افکار کی مکمل تصویر ان کے سامنے تھی، انھوں نے اس وسیع تاریخی میدان میں اپنی تاریخی بصیرت سے رہبری کے چند ستون الفاروق، الغزالی، المامون کی شکل میں کھڑے کر دیئے تھے، کہ آنے والی نسلیں جب ان منزلوں سے گذریں تو انھیں اپنی تحقیق و جستجو کا میدان پوری طرح نظر آئے۔ شعر العرب پر لکھنے کا شوق تھا۔ اس پر مضمون لکھا۔ اس خیال سے کہ "کسی پہ کبھی عمارت بھی بن جائے گی۔ اور میں اس کام کو نہ کر سکوں گا۔ تو کوئی اور خدا کا بندہ پیدا ہو جائے گا۔" (مقالات۔ جلد ۲ صفحہ ۳۰) یہی وجہ ہے۔ کہ ان کے کاموں کی حیثیت چراغ رہ گزر کی ہے۔

انھوں نے "مجددان اسلام" کا ایک سلسلہ شروع کرنا چاہا تھا۔ لیکن اس ضمن میں صرف علامہ ابن تیمیہ پر ایک مختصر مضمون لکھ سکے تھے۔ اور کہا تھا۔

"مجددیت کی اصلی خصوصیتیں جس قدر علامہ کی ذات میں پائی جاتی ہیں ان کی نظیر بہت کم مل سکتی ہے" (مقالات۔ جلد ۵ صفحہ ۶۳)

مولانا شبلیؒ کا خیال تھا کہ ہر فن کی اہم اور منتخب شخصیتوں پہ تحقیق تاریخ کے وسیع نظریات کی ترجمان بن سکتی ہے' تاریخ کا یہ تصور، اس کے حدود کا یہ احساس، ہر اعتبار سے اس زمانہ میں اپنی مثال آپ تھا۔ انھوں نے قدیم عرب مورخین کے اس نظریے کو قبول کیا تھا کہ تاریخ بادشاہوں کی نہیں، بلکہ ایک عہد کی تاریخ ہونی چاہیے۔ المامون میں انھوں نے عباسی خاندان ہی کی نہیں اس دور کے تمدن کی تصویر کھینچ دی ہے۔

پھر مولانا شبلیؒ نے ماخذ کی تلاش اور تحقیق کی جو مثال قائم کی وہ حیرت انگیز تھی۔ سر جدوناتھ سرکار جنھوں نے بعد کو اپنی زندگی کے ۶۰-۶۵ سال اورنگ زیب اور اس کے عہد کے مطالعہ میں بسر کئے ۱۹۰۴ء میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے جے سنگھ اور اورنگ زیب کے مکتوبات کے ایک نایاب مجموعہ کا پتہ دیا، اور بتایا کہ یہ بنارس کے ایک کایستھ خاندان میں محفوظ ہے۔ سرکار نے تین بار بنارس کا سفر اس کی تلاش میں کیا اور بالآخر اسی خاندان میں وہ نسخہ ملا۔

ہندوستان اور ترکی کے کتب خانے مولانا شبلیؒ نے بڑی محنت سے دیکھے تھے، جب کوئی کتاب جرمنی، انگلستان یا مصر میں شائع ہوتی تو وہ اس کو حاصل کرنے کے لئے بے چین ہو جاتے تھے، اس ضمن میں مستشرقین کے احسانات کا اعتراف انھوں نے بہت کھلے دل سے کیا ہے، جب طبقات ابن سعد چھپ کر آئی تو لکھا۔

"ہم نہایت فیاض دلی سے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یورپ کو آج کل ہمارے علوم و فنون کے ساتھ جو اعتنا ہے اور جس طرح وہ ہمارے قدیم خزانوں کا بیش بہا نوادر، ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیدا کر رہا ہے، ہم خود نہیں کرتے بلکہ نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ آج تک یورپ نے عربی کی کون کون سی نایاب کتابیں نہایت اہتمام کے ساتھ چھاپ کر شائع کی ہیں۔" (مقالات۔ جلد ۴ صفحہ ۱)

جب عمر خیام کی جبر و مقابلہ پر کتاب پیرس سے چھپی تو اُن کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ اسی کتاب سے پتہ چلا کہ اس ضمن میں ہندسی قواعد پر عمر خیام نے ایک علیحدہ مستقل کتاب لکھی تھی (مقالات۔ جلد ۴ ص ۱۱)

جب ابن مسکویہ کی تجارب الامم گب میموریل سیریز میں شائع ہو کر آئی تو فرمایا۔

"کیا یورپ نے عربی زبان کی جو خدمت کی ہے، اس کا ہزارواں حصہ بھی آج اسلام کی وسیع دنیا کر سکتی ہے۔" (مقالات۔ جلد ۴ صفحہ ۱۹)

مولانا کے بعد جو اور جس تعداد میں عربی اور فارسی ماخذ چھپے اور دریافت کئے گئے۔ اگر مولانا کی حیات میں شائع ہو جاتے تو ان کی تاریخی فکر ایک نیا عالم تحقیق و ترتیب پیدا کر دیتی۔ ماخذ کی تلاش اور اس کی اشاعت کے جذبے سے بے چین ہو کر انھوں نے ۳ر اپریل ۱۹۰۶ء کو اشاعت کتب قدیمہ کے سلسلہ میں عوام سے مدد کی اپیل کی تھی۔ تاریخی ماخذ کو عام کرنے کے لئے یہ بڑی پرخلوص آواز تھی جس کی بنیاد ان کے اس تاریخی نقطۂ نظر پر تھی۔ کہ جب تک قدیم ماخذ عام نہیں کئے جائیں گے۔

تحقیق کا کام آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ ندوۃ العلماء کا گیارہواں اجلاس جب بنارس میں ہوا تو انھوں نے ایک علمی نمائش کا خصوصی انتظام کیا۔ جس میں عربی اور فارسی کی نادر الوجود قلمی کتابوں کو جمع کیا۔ فرامین شاہی کے متعلق مشورہ دیا۔

"یہ، مسلمانوں کی قدیم تہذیب و انشا پردازی کی یادگار ہیں۔ . . . ان کو ایک خاص ترتیب سے جمع کیا جائے۔ اور اُن سے کارآمد نتائج پیدا کئے جائیں۔"

یہ ۱۹ء کی بات ہے جب National Archives میں بھی فرامین کی اشاعت کا انتظام نہیں ہوا تھا۔

مولانا شبلیؒ کے تاریخی نظریات کا اندازہ اس علمی نمائش کی تفصیلات سے لگایا جا سکتا ہے۔ لٹریچر، شاعری، تاریخ، مصوری، خطاطی، فرامین، ہر چیز کی طرف ان کی نظر گئی تھی، وہ فارسی شاعری کے عہد بہ عہد ارتقا کی تاریخ کو بھی اس نمائش میں واضح کرنا چاہتے تھے۔ اسی طرح ان کا خیال تھا کہ

"مسلمانوں کے گذشتہ علمی کارنامے اور ترقیوں کے بغیر کسی تفصیل، استدلال، استخراج نتائج اور تحریر کے محض کتابوں کے منظم اور مرتب صورت سے ایک مکمل تاریخ پیش کر دے۔"

(مقالات۔ جلد ۸ صفحہ ۷۴)

آج یورپ اور امریکہ کے میوزیم اسی اصول پر قائم ہیں!

تنقید روایت ہائے تاریخی کے سلسلہ میں مولانا شبلیؒ نے جو اصول مرتب کئے اور جو راہیں دکھائیں۔ وہ کوئی دیانت دار مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ انھوں نے سیرت نبوی کے سلسلہ میں سب سے پہلے ان اصولوں کو سختی سے اختیار کیا۔ اور اعلان کیا کہ

"محدثین نے جو اصول قرار دیئے تھے سیرت کی روایتوں میں لوگوں نے اکثر نظرانداز کر دیئے ہیں، محدثین کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ روایت کا سلسلہ اصل واقعہ تک

کہیں منقطع نہ ہونے پائے۔" (سیرۃ النبیؐ جلد ۱ صفحہ ۴۰)

سیرۃ النبیؐ کے سلسلہ میں جو اصول مولانا شبلیؒ نے متعین کیے تھے۔ وہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔

مولانا شبلیؒ کو ارباب سیر کے اس رویہ سے شکایت تھی کہ وہ اکثر واقعات کے اسباب و علل سے بحث نہیں کرتے۔" (سیرۃ النبیؐ۔ جلد ۱ صفحہ ۴۳)

الندوہ میں ایک بار لکھا۔

"...... بے شبہ عہد نبوت اور خلافت کے واقعات تائید الٰہی ہیں لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ سلسلہ اسباب سے الگ ہیں، جو سچائی، جو خلوص، جو جوش، جو راست کرداری جو عدل و انصاف، جو حق پرستی ان معرکوں میں صرف کی گئی، جب کبھی صرف کیجائے گی بعینہ یہی نتائج ظاہر ہوں گے۔ اگر ان لڑائیوں میں اسباب و علل کو دخل نہ ہوتا تو جنگ احد میں شکست کیوں ہوتی؟ حنین میں اکثر لوگوں کے پاؤں کیوں اکھڑ جاتے؟ ....."

(الندوہ۔ جلد ۶ نمبر ۵ جمادی الاول ۱۳۲۷ھ)

اس انداز تحقیق سے دور حاضر کے سارے تنقیدی تاریخی اصول پورے ہوتے ہیں۔ اور علامہ شبلیؒ کا مرتبہ بحیثیت مورخ نہایت بلند ہو جاتا ہے۔

پھر جہاں تک انداز بیان کا تعلق ہے شبلی کا اسلوب شگفتہ، جاندار اور موثر تھا لیکن ان کی شگفتہ نگاری نے تاریخی حقائق کو کہیں مجروح ہونے نہیں دیا۔ ان کے دو معاصر مورخ اس ضمن میں فوراً ذہن میں آتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا ذکا اللہ دہلوی۔ مولانا ذکا اللہ کی تصانیف واقعات کی کھتونی ہیں۔ انھوں نے ماخذ کا ترجمہ نہایت محنت اور دیانت داری سے کیا۔ اور اسی کو تاریخ سمجھا، اس لئے ان کی محنت میں جان نہ پڑ سکی۔ محمد حسین آزاد کو خود مولانا شبلیؒ اردو کا سب سے بڑا

انشاء پرداز کہتے تھے، ان کی قصص الہند، تاریخی ذہن کو بیدار کرنے میں بے مثال ہے، لیکن آزاد نے تاریخ کو اپنی انشاء پردازی کے ماتحت رکھا۔ اس کے برعکس شبلی نے اپنی انشاء پردازی کو تاریخ کے ماتحت کر دیا۔ یہ مقصد اور طریقۂ کار کا بہت بڑا فرق تھا۔ آزاد۔ ذوق تصویر کشی میں اس طرح محو ہو جاتے ہیں۔ کہ تاریخی حقائق ان کے لئے ثانوی درجہ میں پہونچ جاتے ہیں۔ ان کی ..... دربار اکبری وغیرہ انشاء پردازی کے بہترین نمونے ہیں لیکن ان میں مورخ کی احتیاط نہیں۔ ان کی انشاء پردازی ان کا احاطہ تحریر متعین کرتی تھی، شبلی کے یہاں ان کا مواد یہ کام انجام دیتا تھا۔ ان کے یہاں اگر کہیں کوئی بات جچی تلی نہیں ہے تو اس کا سبب انشاء پردازی نہیں۔ بلکہ نفس مضمون کے تقاضے ہیں، بعض مصنفین نے ایسے مقامات کی نشاندہی کی ہے۔ اور تاریخی اعتبار سے تنقید کی ہے، لیکن انھوں نے اردو زبان کے مزاج اور نفس مضمون کے تقاضوں کو پیش نظر نہیں رکھا۔ شبلی تاریخی مواد کے بغیر قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ آزاد کے سخندان فارس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"آزاد کی کتاب آئی۔ جانتا تھا۔ کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں تاہم ادھر ادھر کی گپیں بھی ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ گیارہ گھڑ تک اس نے میری سرحد پر قدم نہیں رکھا۔ بارہویں میں یہ میدان میں اترا ہے۔ لیکن زور پہلے صرف ہو چکا تھا یونہی سرسری چکر لگا کر نکل گیا۔"

شبلی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تحقیق، انشاء پردازی اور حقیقت نگاری کو اس طرح سمو دیا کہ کسی دوسرے کو میسر نہ آیا۔ سرسید نے ان کی اس خصوصیت کا اندازہ لگایا تھا۔ اور المامون کے مقدمہ لکھا تھا۔

"عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے۔ اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے۔" (المامون۔ صفحہ ۳)

اس گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے ایک خاص رجحان کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ جس نے موجودہ نسل کے ذہن پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔ اسلامی اور ہندوستانی تاریخ کو مسخ کرنے کا کام جب خطرناک حد تک پہونچ گیا، تو اصلاح حال کے لیے بعض مسلمان مصنفین نے اپنا قلم اٹھایا۔ پر فریب ذہنوں نے اُن کے دلائل پر غور کرنے کے بجائے اس سارے لٹریچر کو apologetic literature جوابی اور معذرت آمیز کہہ کر اس کی اہمیت کو کم کر دیا۔ اور مطالعہ سے پہلے ہی، ان مصنفین کے انداز تحقیق کو مشتبہ بنا دیا۔ یہ صورت حال سر سید، شبلی، امیر علی، اقبال سب کے ساتھ پیش آئی، اور خود مسلمانوں کی یہ کیفیت ہو گئی کہ وہ اس پر یقین کرنے لگے۔ مولانا شبلیؒ نے اس کیفیت کی ترجمانی اس شعر میں کی ہے۔ جو جہانگیر کے سلسلہ میں لکھا ہے:۔

بہ من چند اں گنہ از بد گمانی میکند نسبت　　　　که من هم در گمان افتاده پندارم گنهگارم

مولانا شبلیؒ کی بعض بہترین علمی کاوشوں، اسکندریہ کا کتب خانہ، اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، الجزیہ، حقوق الذمیین کے ساتھ یہی برتاؤ کیا گیا ہے، ضرورت ہے کہ جدید نسل کا ذہن اس پوری نفسیاتی پیچیدگی سے نکالا جائے، اور وہ معروضی طور پر تاریخی واقعات کا جائزہ لے سکیں اور انھیں اندازہ ہو کہ مولانا شبلیؒ نے کس دیانت داری کے ساتھ اپنی مورخانہ ذمہ داریوں کو پورا کیا ہے۔ مآثر رحیمی پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا۔

"اس کتاب میں خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہے کہ خان خانان کی خوبیاں ہی خوبیاں گنائی گئی ہیں، نکتہ چینی کا نام نہیں، حالانکہ آج کل کے مذاق کے موافق سوانح عمری اور لائف کی یہ ضروری شرط ہے، لیکن اس طریقے کو ہم آج کل کے پر فریب طریقے سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جس میں راست نویسی، اور تنقید کا بہت کچھ دعوی کر کے بھی سوانح عمری کے بجائے مناقب کی کتاب لکھی جاتی ہے۔ اور کوئی عیب اور وہ بھی خفیف کر کے لکھا جاتا ہے

تو اس غرض سے کہ محاسن کے یقین کرانے کے کام آئے۔ یعنی جب عیب نہیں چھپایا ہے۔ تو محاسن کیوں غلط لکھے ہوں گے۔"

(مقالات۔ جلد ۴ صفحہ ۸۱)

نامناسب نہ ہوگا اگر تاریخی نقطۂ نظر سے مولانا شبلیؒ کی تصانیف پر ایک نظر ڈالی جائے" مولانا خود اپنی تصانیف میں" الفاروق "کو سب سے اونچا درجہ دیتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ وہ پختہ نظریۂ تاریخ اور انداز تحقیق و تنقید تھا۔ جو اس کی امتیازی خصوصیت ہے۔ انھوں نے درایت کا اصول دل کھول کر استعمال کیا ہے۔ ریاض النضرۃ لمحب الطبری۔ اور ازالۃ الخفا کے بعد یہ سب سے مفصل اور جاندار سوانح ہے۔ جس میں جدید نظریات کی جلوہ گری بھی ہے۔ اور واقعات کی تحقیق بھی۔ مولانا شبلیؒ نے حضرت عمرؓ کی اولیات کو تاریخ طبری اور کتاب الاوائل لابی ہلال العسکری سے نہایت موثر طریقہ پر یکجا کیا ہے۔ ازالۃ الخفا کے جس اقتباس پر کتاب کو ختم کیا ہے۔ اس سے پوری تصنیف میں ایک جان پڑ گئی ہے۔

"سیرۃ النعمان" کا پہلا حصہ جس میں حالات زندگی سے بحث ہے، معروف کتابوں سے ماخوذ ہے۔ لیکن دوسرے حصہ میں جہاں امام صاحبؒ کی فقیہانہ بصیرت سے بحث کی ہے۔ غیر معمولی بصیرت اور نکتہ رسی کی عکاسی کرتا ہے۔ مورخ سبط ابن جوزی نے امام صاحب کے مسائل سے ایک کتاب میں تفصیلی بحث کی ہے۔ جس کے متعلق صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ یہ کتاب اپنے باب میں بے نظیر ہے۔ شبلی کو اس کتاب کے حاصل نہ ہوسکنے کا بڑا رنج تھا۔ لیکن پھر بھی انھوں نے اپنی تحقیق کا ہاتھ دور دور پھیلایا۔ اور نہایت اعتماد کے ساتھ اعلان کیا۔

"امام ابو حنیفہ کو جس بات نے تمام ہم عصروں میں امتیاز دیا وہ اور چیز ہے۔ جو ان سب باتوں سے بالاتر ہے۔ یعنی احادیث کی تنقید اور بلحاظ ثبوت احکام ان کے مراتب کی تفریق ــــــ تنقید احادیث، اصول درایت، امتیاز مراتب

ہیں امام ابو حنیفہ کی تحقیق کی جو حد ہے۔ آج بھی ترقی کا قدم اس سے آگے نہیں بڑھا"

(سیرۃ النعمان۔ صفحہ ۱۴۱)

اقبال کے یہاں ان افکار کی صدائے بازگشت اس طرح سنائی دیتی ہے۔

The attitude of Abu Hanifa towards the traditions of a purely legal import is to my mind perfectly sound; and if modern Libieralism considers it safer not to make any indiscriminate use of them as a source of law, it will be only following one of the greatest exponents of Mohammadan Law in Sunni Islam." (Reconstruction of Religious Thought in Islam, P 172)

مولانا شبلیؒ نے رومن لا اور حنفی فقہ کی بحث میں زیادہ دخل نہیں دیا۔ اس مسئلہ پر جس وقت نظر اور استقصار کے ساتھ مقابلہ کی ضرورت تھی، اس کے وسائل انھیں میسر نہ تھے۔ لیکن پھر بھی اس سلسلہ میں جس محتاط انداز میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اس سے ان کی مورخانہ دیانت داری کا احساس ہوتا ہے۔

"الغزالی" میں امام صاحبؒ کے حالات جمع کرنے میں ہی مولانا نے کاوش نہیں کی، بلکہ ان کتابوں کی بھی نشاندہی کی جن کے نمونہ پر احیاء العلوم لکھی گئی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ امام صاحب نے معاشرت کے جو آداب لکھے ہیں، وہ ایشیائی طریقہ کی بہ نسبت زیادہ تر مہذب ممالک کے طریقے سے ملتے ہیں۔" (صفحہ ۱۰)

فلسفہ سے امام صاحب کے تعلق پر جو بحث کی ہے۔ وہ بصیرت افروز ہے۔ اور امام صاحب کا تاریخ فلسفہ میں مقام متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ امام صاحب کے اثرات کی تحقیق کو صرف فلسفہ اور مذہب تک محدود نہیں رکھا بلکہ فارسی شاعری تک میں ان کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"غرض فارسی شاعری میں تاثیر کا جو نشہ پیدا ہوا وہ تصوف کی بدولت ہوا۔ اور تصوف کا مذاق جو زبان میں آیا۔ امام غزالی کی بدولت آیا"۔ (الغزالی۔ صفحہ ۲۶۶)

امام صاحب سے عقیدت کے باوجود تنقید کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ امام صاحب کو اپنا ہیرو بناتے ہیں۔ لیکن درایتی اصول ان پر بھی سختی سے نافذ کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"احیاء العلوم میں احادیث کے نقل کرنے میں نہایت بے احتیاطی کی ہے۔ سیکڑوں ہزاروں حدیثیں موضوع اور ضعیف نقل کر دی ہیں، جن کا کتب احادیث میں کہیں پتہ نہیں"۔ (صفحہ ۲۶۱)

سوانح کا مطالعہ اس جملہ پر ختم کرتے ہیں۔

"بہرحال امام صاحب امام تھے۔ پیغمبر نہ تھے۔ اور پیغمبر کے سوا کسی شخص کو عصمت کا رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا"۔ (صفحہ ۲۷۲)

تعجب ہے کہ جن مصنفین نے مولانا شبلیؒ پر اپنے ہیرو کی بے جا تعریف کا الزام لگایا ہے۔ انھوں نے ایسے بیانات کو کیوں نظر انداز کر دیا!

مولانا شبلیؒ نے "سوانح مولانا روم" کو اپنے سلسلۂ کلامیہ کا چوتھا نمبر بنا کر اپنے تاریخی ذہن کی

کارفرمائی کا ثبوت دیا ہے۔ علم الکلام، الکلام، الغزالی کے بعد سوانح مولانا روم اس ذہنی تسلسل کی نشاندہی کرتا ہے۔ جو اسلامی ثقافت اور فکر کی تاریخ مرتب کرنے میں اُن کی رہنمائی کر رہا تھا۔ "فیہ مافیہ" جس کو مولانا عبد الماجد دریابادی نے شائع کر دیا تھا۔ مولانا کے زمانہ میں بالکل نایاب تھی۔ (سوانح۔ صفحہ ۴۶)

مولانا نے رومی کے افکار کا تجزیہ اور مثنوی کی خصوصیات کی نشاندہی میں اپنے تحقیقی اور تاریخی دونوں پیمانوں کو سامنے رکھا ہے۔ مسئلۂ ارتقار کے متعلق رومی کے نظریات کو سب سے پہلے انھوں نے پیش کیا۔

شعرالعجم کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس میں فارسی شعر کی تاریخ اس انداز سے پیش کی گئی ہے کہ شاعری تاریخ کا ایک اہم ذریعۂ معلومات بن گئی ہے۔ انھوں نے اشعار سے روح عصر کو سمجھنے کا کام لیا ہے۔ شاعروں کی ذہنی کیفیات کا مطالعہ کیا ہے اور کروبر (Kroeber) کے اس قول کو صحیح ثابت کر دکھایا ہے کہ کسی دور کی روح اس کے نثری کارناموں میں نہیں، بلکہ شعری کارناموں میں جھلکتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ مولانا کا مقصد فارسی شعر کی تاریخ مرتب کرنا تھا۔ شعراء کی سوانح حیات لکھنا نہ تھا۔ وہ شعرالعجم سے پہلے شعر العرب لکھنا چاہتے تھے۔ اس کو نہ لکھ سکنے کا ان کو ہمیشہ ملال رہا۔ لیکن مانع یہ احساس تھا کہ اس کو پڑھنے والے کہاں سے آئیں گے۔ (مقالات۔ جلد ۲ صفحہ ۲۹)

تاریخی مضامین میں شبلی کا مضمون کتب خانہ اسکندریہ ان کے انداز تحقیق، مورخانہ دیدہ وری کا بہترین آئینہ دار ہے۔ جزیہ اور ذمیوں کے حقوق پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اگر ان خطوط پر تحقیق کی جائے تو اسلامی تاریخ کے متعلق بہت سی بدگمانیاں دور ہو جائیں۔ اورنگ زیب پر ان کا کام مورخانہ بصیرت کا حامل ہے۔ زیب النسار پر ان کا مضمون، ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدنی اثرات کا تجزیہ، نئے مواد کو سامنے لایا۔ تحفتہ الہند کو انھوں ہی نے پہلی بار روشناس کرایا

جس سے اورنگ زیب کی سنسکرت اور ہندو علوم میں دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ (مقالات۔ جلد ۲ صفحہ ۹۳-۹۴) ان کا خیال تھا کہ عالمگیر کے زمانہ میں مسلمانوں نے بھاشا زبان پر جس قدر توجہ کی پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ (مقالات۔ جلد ۲ صفحہ ۸۵) ان کی وسعت معلومات اور کتابوں کے حصول میں ان کی جد وجہد کا اندازہ ان کے مکاتیب سے لگایا جاسکتا ہے۔ دارا شکوہ کا اپنشد کا ترجمہ اب شائع ہوا ہے لیکن مولانا شبلیؒ آج سے ۷۰، ۷۵ سال پہلے اس کا مطالعہ کر چکے تھے، (مکاتیب حصہ دوم۔ صفحہ ۵۹) البیرونی کی قانون مسعودی کا چرچا ابھی پچھلے چند سالوں میں ہوا ہے۔ لیکن مولانا اپنے زمانہ میں اس کا بغور مطالعہ کر چکے تھے، ایک خط میں لکھتے ہیں، کہ پہلے صفحوں میں دس بارہ سطر کے بعد ایک شخص کا قول نقل کیا ہے۔ جو حرکت ارض کا قائل تھا۔ (مکاتیب شبلی۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۵۸)

مشرقی تاریخ بالخصوص تاریخ اسلام اور ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد حکومت کے متعلق شبلی نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ حالی نے صحیح کہا تھا۔ ؎

ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن
تو شبلیؔ سا وحیدِ عصر، یکتائے زمن دیکھیں

کلکتہ میں کُل ہند

فارسی اساتذہ کانفرنس

از

ڈاکٹر محمد امین۔ کلکتہ یونیورسٹی۔

مرزا اسد اللہ غالب نے تقریباً ڈیڑھ سال کلکتہ میں قیام کیا۔ اس شہرِ نگاراں کی خوبصورتی اور رعنائی سے وہ متاثر ہی نہیں ہوئے۔ بلکہ یہاں کے دانشوروں اور فنکاروں کی فارسی خدمات، ان کی محفل شعر و ادب کا بھی اثر قبول کیا اُس کا ثبوت مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے صحن میں فارسی کا وہ یادگار مشاعرہ ہے۔ اس میں زبان اور فن شاعری پر ایسی بحث شروع ہوئی تھی جس کے بعد "باد مخالف" جیسی مثنوی قلمبند ہوئی۔ غالب کے عہد میں بھی عروس البلاد کلکتہ فارسی زبان و ادب کا ایک اہم مرکز اور گہوارہ تھا اُس شہر نگاراں میں جس کے لیے غالب دلّی پہونچنے کے بعد بھی تڑپتے رہے۔ پہلی بار استادان و دانشورانِ فارسی کی سہ روزہ کانفرنس ہوئی۔ جس نے یہاں کے سوئے ہوئے لوگوں کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ اور فارسی زبان و ادب سے ان کی دلچسپی بحال کی۔ سرزمین بنگال میں فارسی کی تاریخ مسلمانوں کی اس خطہ میں آمد اور یہاں بود و باش اختیار کرنے کے بعد ہی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ عروس البلاد عرصۂ دراز سے رنگا رنگ تہذیبوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کی تہذیبی اور تمدنی زندگی میں جن قوموں نے اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ ان میں وسط ایشیا کے مسلمان فاتحین کا حصہ نمایاں ہے، بارہویں صدی کے اواخر ہی سے افغان فاتحین کے قدم بنگال میں جمنے لگے تھے۔ تیرہویں صدی کے شروع میں اختیار الدین

محمد بن بختیار الدین خلجی کا بنگال پر حملہ اور مسلمان سپاہیوں کا اس کی راجدھانی لکھنوتی پر قبضہ سیاسی اور سماجی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے بعد اہل حرفت و علماء و ادبا اور صوفیائے کرام کی ایک بڑی تعداد بنگال میں آئی، اور اس کو اپنا مسکن قرار دیا۔ انھوں نے مقامی لوگوں سے سماجی اور ازدواجی تعلقات قائم کر کے اور یہاں کی معاشرتی اور سماجی زندگی میں ایک بڑے انقلاب اور تبدیلی کے محرک ہوئے۔ ہندوستان کے اس مشرقی خطہ میں مسلمانوں کی تہذیبی اور تمدنی زندگی کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ مقامی باشندوں نے ان ہی کی زبان، تہذیب اور ثقافت کو اپنی زندگی اور معاشرہ کا جز بنالیا اسطرح فارسی زبان کو جو مسلمانوں کی درباری اور عدالتی زبان تھی، شرف قبولیت حاصل ہوئی۔ حکمران طبقہ اور خاص کر صوفیائے کرام نے فارسی زبان کو بنگال میں مقبول بنانے میں اہم رول ادا کئے ہیں۔ ان بزرگوں میں شاہ جلال الدین تبریزی، سید جلال الدین مجرد یمنی۔ اخی سراج الدین۔ علاء الدین علاء الحق پنڈوی، سید اشرف جہاں گیر سمنانی، سید نور الدین قطب عالم، شیخ حمید الدین دانشمند بردوانی۔ صوفی فتح علی دلیسی اور سید مرشد علی القادری نے رشد و ہدایت کے چراغ جلائے۔ جس سے فارسی زبان کو مقبول عام بنانے کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے، یہ ان ہی بزرگون کا فیض ہے۔ کہ فارسی زبان و ادب بنگال کی گذشتہ ساڑھے چھ سو سالہ تاریخ میں ہر قسم کے انقلابات کے باوجود یہاں کی سماجی و لسانی زندگی اور اس کی درسگاہوں میں آج بھی رائج ہے۔ اس سلسلہ میں خوشی کی بات ہے کہ فارسی زبان و ادب کی سرپرستی اور خدمت یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں اور عیسائیوں سب نے مل کر کی ہے۔ اس کی زلف گرہ گیر کے اسیروں میں بھارت چندر رائے گونا کر، راجہ رام موہن رائے۔ منشی تارنی چرن مترا۔ گریس چندر اسین۔ مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق، منشی ہری ہر دت۔ منشی سدا سکھ۔ اور دیوبندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ جان بارتھوک گلکرسٹ فرانسس گلیڈون۔ ٹامس روبک۔ سر ولیم جونس۔ ہنری پامر ایلوخ مین اور دلاوی میراد نیو کے نام نمایاں ہیں۔ مسلمانوں میں میر بہادر علی حسینی۔ میر شیر علی افسوس۔ میر امن دہلوی۔ کاظم علی جوان۔

حفیظ الدین بردوانی۔ آغا احمد علی، عبدالغفور نساخ، سید محمود آزاد۔ قاضی اختر، عبیدی سہروردی، عبدالرؤف وحید۔ پروفیسر محمد زبیر صدیقی۔ پروفیسر محفوظ الحق اور ڈاکٹر محمد اسحٰق نے گیسوئے فارسی کو سنوارنے میں پوری دلچسپی دکھائی ہے۔

اگرچہ انقلاب زمانہ کے ہاتھوں فارسی زبان اپنی سابقہ عظمت پر باقی نہیں رہی، مگر اس کی ادبی لطافت و توانائی اور اس کی سیاسی اہمیت کے پیش نظر فارسی زبان و ادب کا سکہ ہندوستان کی درسگاہوں میں آج بھی جاری ہے۔ اس زبان کے فروغ میں کلکتہ یونیورسٹی کے علاوہ مدرسہ عالیہ کلکتہ۔ ایشیاٹک سوسائٹی اور ایران سوسائٹی کلکتہ نے نمایاں حصہ لیا ہے نیشنل لائبریری۔ ایشیاٹک سوسائٹی اور وکٹوریہ میموریل میں فارسی کے بیش بہا قلمی اور مطبوعہ خزانے محفوظ ہیں۔ اس لحاظ سے شہر کلکتہ کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے ایران سوسائٹی جکا بنیادی مقصد فارسی زبان و ادب کو فروغ دینا ہے تقریباً چالیس سال سے۔ . . . .

اپنے بنیادی مقاصد کی تکمیل کے لیے کوشاں ہے۔ اس ادارہ سے شائع ہونے والے مجلہ انڈو ایرانیکا کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے اور اس کے مقالے علمی دنیا میں عزت کی نگاہ سے دیکھے اور دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسحٰق نے ایران سوسائٹی کے ذریعہ سے شہر کلکتہ میں فارسی زبان و ادب کا سحر امتزاق اور خوشگوار ماحول پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ جب کل ہند فارسی اساتذہ کی انجمن نے کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی کے تحت اور ایران سوسائٹی کے تعاون سے انجمن ہذا کی تین روزہ کانفرنس شہر کلکتہ میں ۲۹۔ ۳۰۔ اور ۳۱ دسمبر کو منعقد کرنے کی خواہش کی تو ایران سوسائٹی نے کل ہند فارسی اساتذہ کی انجمن کو مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ شہر کلکتہ میں یہ کانفرنس اپنی نوعیت اور ظاہری حقیقت سے بہت کامیاب رہی۔ مختلف ملکوں کے مندوبین کی شرکت اور موضوع کے لحاظ سے اس میں بین الاقوامی رنگ پیدا ہوگیا۔ اس میں ہندوستان کے اساتذہ کے علاوہ ایران روس اور بنگلہ دیش سے مندوب

شریک ہوئے۔ جمہوری اسلامی ایران کے سفیر کبیر عزت مآب ڈاکٹر ابراہیم بہنام کردی، ایرانی سفارت خانہ کے کلچرل کونسلر ڈاکٹر محسن عسکری راد۔ ہندوستان میں فارسی تحقیقات کے ڈائرکٹر ڈاکٹر احمد حسینی۔ تہران یونیورسٹی سے پروفیسر سید جعفر شہیدی اور پروفیسر اسمٰعیل حاکمی۔ تبریز یونیورسٹی سے پروفیسر ایمن مرکاراتی کلکتہ تشریف لائے۔ روس سے غالب کی پرستار اور محقق ناتالیا پریگارینا اور بنگلہ دیش سے پروفیسر محمد کلیم اور محترمہ کلثوم بشر نے شرکت کی۔ ہندوستان کی تقریباً تمام اعلیٰ درگاہوں سے جہاں فارسی درس و تدریس کا بندوبست ہے۔ تقریباً ۱۵۰ مندوبین شریک ہوئے۔ کانفرنس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس کی کامیابی کے لیے وزیر اعظم راجیو گاندھی، شری بلرام جھاکر اسپیکر لوک سبھا، ڈاکٹر نجمہ ہبت اللہ ڈپٹی اسپیکر راجیہ سبھا، جناب سید مظفر الدین برنی گورنر ہریانہ، پروفیسر سمبھو گھوش وزیر اعلیٰ برائے تعلیم مغربی بنگال، پروفیسر مونس رضا، وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی۔ پروفیسر علی اشرف وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور پروفیسر وحید الرحمٰن پرو وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اس کانفرنس کی کامیابی کے لیے پیغامات ارسال کئے۔ دانشوروں اور ارباب سیاست نے فارسی ادب و ثقافت سے متعلق جن نیک خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے امید بندھتی ہے کہ پھر ایک بار ہندوستان کی درسگاہوں میں اسے سابقہ جگہ ملے گی۔ اور فارسی زبان کا نشاۃ ثانیہ برصغیر میں ہوگا۔

اس کانفرنس کا افتتاح کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر سنتوش کمار بھٹاچاریہ نے ایران سوسائٹی کے لان پر خوشنما پنڈال کے سایہ میں اتوار ۲۹ دسمبر دن کے گیارہ بجے کیا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں وائس چانسلر موصوف نے ہندوستان میں فارسی زبان اور ثقافت کے شاندار ماضی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں بھی اس کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ آپ نے کہا چونکہ برطانوی دور میں اس کی سرکاری حیثیت ختم کر دی گئی تھی۔ اس لیے عوام سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اور لوگوں کی دلچسپی

اس زبان سے کم ہو گئی۔ انھوں نے اس امر پر زور دیا کہ ہندوستان کے مخلوط کلچر کے مطالعہ کے لیے فارسی زبان وادب کی ترویج واشاعت ضروری ہے۔ پروفیسر بھٹا چاریہ نے اس بات پر اطمینان ظاہر کیا کہ کلکتہ یونیورسٹی کا فارسی و عربی شعبہ اطمینان بخش طور پر کام کر رہا ہے۔ انھوں نے مندوبین کو اطمینان دلایا کہ کلکتہ یونیورسٹی کے سامنے فارسی علوم و فنون کے مطالعہ کے لیے کئی منصوبے زیر غور ہیں۔ اور انھیں جلد ہی عمل میں لایا جائے گا۔ جمہوری اسلامی ایران کے سفیر ڈاکٹر ابراہیم بہنام دہ کردی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر میں کہا کہ انھیں فارسی اساتذہ کی، اس کانفرنس میں شرکت سے دلی مسرت ہو رہی ہے۔ سرزمین کلکتہ میں فارسی اساتذہ کی اتنی کثیر تعداد اور عوام سے اس کی گہری دلچسپی ثابت کرتی ہے کہ فارسی زبان اور اس کی ثقافت سے مغربی بنگال کے لوگوں کا رشتہ گہرا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان جس نے امیر خسرو، نظیری، غالب اور اقبال کو جنم دیا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ یہاں کے فارسی ادب کا تجزیہ کر کے اس کی خدمت کو اجاگر کیا جائے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ہندوستان اور ایران کے علمی و ثقافتی رشتہ کو مستحکم کرنے کے لئے دونوں ملکوں کے درمیان محققوں اور دانشوروں کے تبادلہ کا سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ جس کے تحت تین فارسی کے ریسرچ اسکالر ہندوستان سے ایران جائینگے اور دو ایرانی استاد ہندوستان آئیں گے۔ سفیر کبیر موصوف نے فارسی اساتذہ کو اپنی حکومت کی طرف سے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔

مہمان اعزازی سابق وزیر تعلیم حکومت ہند ڈاکٹر پرتاپ چندرا چندر نے اپنی تقریر میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ نئی نسل ہمارے اسلاف کے کارناموں کو فراموش کر رہی ہے۔ فارسی زبان وادب کا گرانقدر خزانہ ضائع ہو رہا ہے۔ فارسی زبان و ادب کا معیار تعلیم ہندوستان کی درسگاہوں میں پست ہو گیا ہے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ہم اپنے طلبہ کے دل و دماغ میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرا دیں کہ فارسی اور دوسری کلاسیکی زبانوں کے مطالعہ کے بغیر وہ اپنی مادری زبان پر

دسترس حاصل نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر چندر کا خیال ہے کہ اردو زبان سے بخوبی واقفیت کے لیے فارسی کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنی مثال پیش کی کہ جب وہ اردو کا مطالعہ کر رہے تھے تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکے کیونکہ فارسی کی بنیادی تعلیم انھیں حاصل نہیں تھی، انھوں نے جدید فارسی کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینے پر زور دیا۔ ایران سوسائٹی کے صدر جناب ایس بی رے نے بھی ڈاکٹر چندر کے خیال کی تائید کرتے ہوئے۔ جدید فارسی پر قدرت حاصل کرنے کے لئے طلبہ کو تلقین کی۔ تہران یونیورسٹی کے پروفیسر سید جعفر شہیدی، جنھوں نے لغت نامہ دہ خدا بڑی محنت اور کاوش سے ۵۰ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ دیگر مغربی ملکوں کی دعوت کو نظر انداز کر کے فارسی اساتذہ کی کانفرنس کو ترجیح دی اور کلکتہ تشریف لائے اور کانفرنس کی تمام نشستوں میں شرکت کی۔ انھوں نے مذکورہ لغت کا مکمل سٹ جس کی لاگت ایک لاکھ روپیہ ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کو بطور عطیہ پیش کرنے کا وعدہ کیا۔

افتتاحی اجلاس کے صدر پروفیسر سید امیر حسن عابدی نے اپنے صدارتی خطبہ میں بنگال میں فارسی زبان وادب کی خدمت کا ایک جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے بنگال کے مشہور عالم پروفیسر محمد زبیر صدیقی اور ڈاکٹر محمد اسحٰق کی خدمات کا خاص طور سے ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ بنگال کے عوام کو شروع ہی سے فارسی زبان سے دلچسپی رہی ہے۔ اس کا اعتراف خود حافظ کے کلام میں ملتا ہے۔ کلکتہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کی سرزمین میں فارسی کا پہلا ہفتہ وار اخبار مرآۃ الاخبار ۱۸۲۲ء میں شائع ہوا۔ آج بھی ایران سوسائٹی کلکتہ فارسی زبان کے کارواں کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے پروفیسر عطا کریم برق کی خدمات کا بھی اعتراف کیا۔

اس سہ روزہ سمینار میں تقریباً پچاس گرانقدر مقالے فارسی زبان وادب کے مختلف عنوانات پر فارسی، اردو اور انگریزی میں پڑھے گئے۔ تہران یونیورسٹی کے پروفیسر سید جعفر شہیدی نے "ہنر آفرینی حافظ شیرازی"

کے عنوان سے ایک گرانقدر مقالہ فارسی میں پڑھا۔ پروفیسر شہیدی نے حافظ کی شاعری کی فنی خصوصیات سے بحث کی اور اس فن میں ان کا مقابلہ ہم عصر شعرا سے کیا۔ سامعین نے اس مقالہ کے اختتام پر پروفیسر موصوف کو ہدیۂ تحسین پیش کیا۔ ڈاکٹر بہمن سرکاراتی جو تبریز یونیورسٹی میں علوم السنہ کے استاد ہیں۔ نے پرانی فارسی اور سنسکرت کے باہمی لسانی رشتہ کے موضوع پر ایک تحقیقاتی مقالہ پیش کیا جو کافی پسند کیا گیا۔ ایران سے آئے ہوئے مندوب پروفیسر اسمٰعیل حاکمی نے موجودہ ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد فارسی کے شعری و نثری ادب کا ایک خاکہ پیش کیا۔ راجشاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش سے آئے ہوئے مہمان پروفیسر محمد کلیم نے بنگال میں فارسی زبان و ادب کی تاریخ کے عنوان سے ایک عالمانہ مقالہ فارسی زبان میں پیش کیا۔ روس کے مندوب ڈاکٹر نتالیا پریگارینا جو ماسکو کے انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز میں غالب اور اقبال پر تحقیقی کام کر رہی ہیں۔ نے تاجیکی ادب پر فارسی کے اثرات سے متعلق ایک گرانقدر مقالہ سنایا۔ محترمہ ڈاکٹر آصفہ زمانی (لکھنؤ) نے نول کشور پریس کی فارسی خدمات کا ذکر کیا۔ پروفیسر عبدالجبار (کشمیر) نے فارسی کے درس و تدریس کے مسائل پر اپنے مقالہ کو مرکوز رکھا۔ پروفیسر منقیس خانم (دہلی) نے ایران میں بچوں کے ادب پر سیر حاصل بحث کی۔ ڈاکٹر طلحہ رضوی برق (بہار) نے بہار کے صوفی شعرا کو متعارف کرایا۔ احمد آباد گجرات کی پروفیسر شمشاد عریفی نے امیر خسرو بحیثیت شاعرِ ہند کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ نور السعید اختر (بمبئی) نے "شکارنامہ قطب شاہی" کو متعارف کیا۔ محترمہ شہناز کرمانی (دہلی) نے "حاتم لعبت والا۔ فارسی کی نامور شاعرہ اور صحافی" کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر محمود عالم (دہلی) نے شیخ سعدی اور ہندوستان سے متعلق نہایت دلچسپ مقالہ سنایا۔ ڈاکٹر حافظ محمد طاہر (شانتی نکیتن مغربی بنگال) نے تصوف سے متعلق ایک رسالہ کو سامعین سے متعارف کرایا۔ ڈاکٹر احسان کریم برق (پٹنہ یونیورسٹی) نے اکبر کے عہد کے ایک غیر معروف شاعر ترابی کا تعارف پیش کیا۔ کلکتہ سے راقم الحروف نے مغربی بنگال کی درسگاہوں میں فارسی کی موجودہ حیثیت سے متعلق

اپنا مقالہ فارسی میں پڑھا۔ ڈاکٹر عبدالسبحان نے کلکتہ کا فارسی ادب پیش کیا۔ مولانا آزاد کالج کلکتہ کے شعبۂ فارسی کے لکچرر اور نوجوان محقق ڈاکٹر محمد منصور عالم نے نواب بنگال سے متعلق ایک نادر مخطوطہ "خلاصۃ التواریخ" مصنفہ مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق کو اساتذہ سے روشناس کرایا۔ اسی کالج کے ایک اور ہونہار و جوان سال لکچرر جناب تنویر احمد نے سید محمود آزاد کی فارسی خدمات پر ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر محمد کلیم نے صاحب مقالہ کی محنت اور تحقیق کو سراہتے ہوئے جناب آزاد پر مزید روشنی ڈالی۔ دیگر مقالہ پڑھنے والوں میں ڈاکٹر سمیع الدین (علی گڑھ)، ڈاکٹر ذاکرہ قاسمی (دہلی)، ڈاکٹر چندر شیکھر (دہلی)، ڈاکٹر محمد اسلم خان (دہلی)، ڈاکٹر شمیم الحق صدیقی (دہلی)، ڈاکٹر نسیم میاں قاضی (احمد آباد) اور ڈاکٹر ادریس (دہلی) کے نام قابل ذکر ہیں۔

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ۔ جو برصغیر میں فارسی زبان و ادب کا ایک اہم مرکز ہے اور جس نے فارسی کی اہم کتابوں کو شائع کر کے ہندوستان کے فارسی ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس کانفرنس کی مناسبت سے فارسی کے نادر مخطوطات کی ایک نمائش کا اہتمام اس کی طرف سے کانفرنس کی آخری شام کو ہوا۔ اس ادارہ کے سکریٹری ڈاکٹر چندن رائے چودھری نے ہمایوں کبیر ہال میں مندوبین کا استقبال کرتے ہوئے سوسائٹی کی عربی، فارسی اور اردو کی خدمات کا ایک خاکہ پیش کیا۔ ڈاکٹر چودھری نے اس موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ و ثقافت سے کماحقہٗ واقفیت کے لیے فارسی کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کے اس دور کے اہم منابع و مآخذ فارسی زبان میں پائے جاتے ہیں اور جس کی افادیت کا اعتراف مورخوں نے کیا ہے۔ سوسائٹی کی کوشش ہے کہ فارسی کے ان تاریخی مآخذ کو منظر عام پر لایا جائے۔ ڈاکٹر چودھری نے تہران یونیورسٹی کے پروفیسر اور فارسی زبان و ادب کے جید عالم ڈاکٹر سید جعفر شہیدی کو ایشیاٹک سوسائٹی کی طرف سے وزیٹنگ پروفیسر شپ کی پیشکش کی۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر اینڈ سولائزیشن کے

ڈاکٹر محمد صابر خان نے کہا کہ اگر فارسی کے اساتذہ تاریخ سے متعلق فارسی کی اہم قلمی کتابوں کو جو ہندوستان میں لکھی گئیں، ایڈٹ کریں۔ اور ان کا تنقیدی اڈیشن شائع کریں تو ہندوستان کی تاریخ اور ثقافت پر ان کی ایک عظیم خدمت ہوگی۔ کل ہند فارسی اساتذہ کی کانفرنس کی الوداعی تقریب ۳۱ دسمبر کو ایران سوسائٹی میں ہوئی۔ اختتامی خطبہ جناب خواجہ محمد یوسف۔ سابق صدر ایران سوسائٹی اور سینیر ایڈوکیٹ حکومت مغربی بنگال نے پیش کیا۔ جناب خواجہ محمد یوسف نے اپنے خطبہ میں کہا کہ انیسویں صدی عیسوی میں بنگال کے باشندے بلا تفریق مذہب و ملت اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم عربی و فارسی سے شروع کرتے تھے۔ اس عہد میں شرفا کا کلچر ایرانی تھا اور یہ زمانہ فارسی زبان و ادب کی بہار کا زمانہ کہلاتا ہے۔ مگر انیسویں صدی کی تیسری دہائی کے بعد اس خطہ میں فارسی کا زوال شروع ہوگیا۔ برسوں تک کوئی معیاری تصنیف سامنے نہیں آئی۔ بہت دنوں کے بعد بنگال کے ایک فارسی کے استاد پروفیسر عطا کریم برق نے "تاثیر فارسی در زبان و ادبیات بنگالی" کے موضوع پر دو جلدوں میں ایک تحقیقی مقالہ مکمل کیا۔ تہران یونیورسٹی نے اس مقالہ پر مصنف کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری عطا کی۔ ایران سوسائٹی کلکتہ نے اس تھیسس کی طباعت کا کام شروع کر دیا ہے۔ خواجہ موصوف نے بنگال میں فارسی کی موجودہ تعلیم اور خاص کر دانشگاہ کلکتہ میں اس کی غربت پر اظہار افسوس کیا۔ انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد اور فارسی اساتذہ کی انجمن سے اس کی ترقی اور بقا کے لئے مثبت قدم اٹھانے پر زور دیا۔ اس موقع پر انھوں نے ایرانی مندوبین کی توجہ اس امر پر دلائی کہ اسلامی انقلاب سے قبل ایرانی رسائل، جرائد اور دیگر تصانیف ایران سوسائٹی کی رونق بڑھاتے تھے۔ لیکن موجودہ انقلاب کے بعد اس میں یکسر کمی واقع ہو گئی ہے۔ مغربی بنگال کے اسکالر ایران میں اسلامی انقلاب سے متعلق تفصیلی معلومات چاہتے ہیں۔ تاکہ امام خمینی کی قیادت میں وہاں کی تعلیمی پالیسی میں جو انقلابی تبدیلیاں آرہی ہیں، اس سے واقف ہو سکیں۔ جناب خواجہ نے امید ظاہر کی کہ ایرانی مندوب ہمارے جذبہ کی ترجمانی اپنے ملک میں کریں گے۔

اس تقریب کے مہمان خصوصی مغربی بنگال اسمبلی کے اسپیکر جناب ہاشم عبدالحلیم نے فارسی زبان کو بنگال کے ثقافتی ورثہ کا ایک اہم حصہ قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ فارسی زبان اور اس کے کلچر کے اثرات ہماری روزمرہ زندگی میں رچ بس گئے ہیں۔ سینکڑوں فارسی کے الفاظ اور تراکیب اردو اور بنگلہ زبان میں شامل ہو کر ہماری لسانی زندگی کا جزو بن چکے ہیں۔ اب ہم پر فرض عاید ہوتا ہے کہ اس زبان اور کلچر کی نہ صرف حفاظت کریں بلکہ اس کے فروغ کے لیے بھی مناسب قدم اٹھائیں۔ اس موقعہ پر جناب کلیم الدین شمس ڈپٹی اسپیکر مغربی بنگال اسمبلی نے فارسی کی شیرینی اور اس کی دلآویزی کا ذکر کرتے ہوئے مغربی بنگال کی درسگاہوں میں اسے مناسب نمایندگی اور سہولت دینے کے لئے اپنے تعاون کا یقین دلایا۔

شہر کلکتہ میں کل ہند فارسی اساتذہ کی یہ سہ روزہ کانفرنس توقع سے زیادہ کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ ہم اسے تاریخ ساز کانفرنس بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کی وجہ سے کلکتہ میں فارسی زبان و ادب جو نامساعد حالات کی وجہ سے انحطاط پذیر تھا۔ پھر عوام اور درسگاہوں میں اس کے مقبول ہونے کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔

اس کانفرنس کا ایک عام چرچا شہر نگاراں میں ہو رہا ہے۔ یقیناً یہ کانفرنس جس میں تقریباً ۱۵۰ مندوبین نے دنیا کے چار ملکوں سے آکر شرکت کی۔ فارسی کے مقاصد کو نہ صرف مغربی بنگال بلکہ ہندوستان میں آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوگی۔ مغربی بنگال کے عوام اور خاص کر نئی نسل میں اس کانفرنس نے بیداری کی لہر دوڑا دی ہے۔ نئی نسل جو فارسی سے رفتہ رفتہ نابلد ہوتی جا رہی تھی۔ اور اس کو ایک نیم مردہ زبان سمجھ کر پس پشت ڈالتی جا رہی تھی۔ اب یہ محسوس کرنے لگی ہے کہ ہندوستان کا مخلوط کلچر اسی فارسی زبان کی دین ہے۔ اور یہاں کی زبانوں بالخصوص اردو اور بنگلہ پر اس کے اثرات گہرے ہیں۔ نئی نسل کو اس کا بھی احساس ہوا کہ فارسی ہندوستان میں صرف مسلمانوں کی میراث نہیں ہے۔ بلکہ اس کی ترقی اور توسیع میں ہمارے ہندو بھائیوں نے بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے آج بھی

بنگالی ہندوؤں کا ایک طبقہ فارسی علوم و فنون سے گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ اور وہ جب عمر خیام۔ سعدی۔ اور حافظ کا ذکر کرتے ہیں تو اسی احترام سے کرتے ہیں۔ جس احترام اور عقیدت سے وہ گوی رابیندر ناتھ ٹیگور اور شاعر آتش نوا قاضی نذر الاسلام کا۔ یہ سہ روزہ تقریب اس لئے بھی تاریخی اور یادگار ہوگئی۔ کہ ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد وہاں کے دانشوروں اور عالموں کے افکار و خیالات سے فارسی اساتذہ اور مغربی بنگال کے لوگوں کو بہت حد تک واقفیت ہوئی۔ اس کانفرنس نے بنگال میں فارسی زبان وادب کے بیش بہا خدمات سے ایرانی دانشوروں اور فنکاروں کو واقفیت بہم پہنچائی اور انھیں یہ جان کر حیرت کے ساتھ دلی مسرت ہوئی کہ اس دور افتادہ خطہ میں آج بھی ان کی زبان وادب کے چاہنے والوں کی کمی نہیں، جو باد مخالف میں بھی فارسی کا چراغ جلائے ہوئے ہیں۔

اس کانفرنس کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں دانشگاہ کلکتہ کے شعبۂ فارسی و عربی کے تمام اساتذہ بالخصوص شعبہ کے موجودہ صدر اور کل ہند فارسی اساتذہ کانفرنس کے جوائنٹ سکریٹری پروفیسر سید نہال شاہ القادری ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اور پروفیسر قادری نے اس کانفرنس کے نقابت کے فرائض بھی نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔ مزید اس کی کامیابی میں ایران سوسائٹی نے مکمل تعاون کیا، اسپیکر اور ڈپٹی اسپیکر مغربی بنگال اسمبلی، کلکتہ اور نیٹل چیمبر آف کامرس، اسلامیہ ہائی اسکول، الحاج عبد القیوم، الحاج منظور علی، الحاج شیخ محمد یونس، الحاج منصور احمد، جناب عثمان غنی، جناب حکیم سید فیضان احمد کے علاوہ خواجہ محمد یوسف اور ایم۔ اے مجید صاحبان نے اپنی انتھک کوششوں سے نہ صرف کانفرنس کو کامیاب بنایا بلکہ مندوبین کی خاطر و تواضع اور آسائش کا پورا خیال رکھا۔ آل انڈیا پرشین ٹیچرس ایسوسیشن کے جنرل سکریٹری پروفیسر نور الحسن انصاری اپنی علالت کی وجہ سے کانفرنس میں شریک نہ ہوسکے۔ ان کی جگہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات کے صدر پروفیسر عبد الودود اظہر دہلوی، جوائنٹ سکریٹری اداراہ نے ان کی نمائندگی کی اور ان ہی کی زیر نگرانی یہ کانفرنس اختتام پذیر ہوئی۔

وفیات

آہ! مولانا ابو سلمہؒ

از۔ پروفیسر مسعود حسن صدر شعبۂ عربی و فارسی، مولانا آزاد کالج، کلکتہ

۲۲ دسمبر کی دوپہر کو کلکتہ کے مسلمان ایک بڑے المناک سانحہ سے دوچار ہوئے۔ یہ سانحہ حضرت مولانا ابو سلمہ شفیع احمد صاحبؒ کی رحلت ہے۔ جو ۴-۵ ماہ کی طویل اور صبر آزما علالت کے بعد ۷۳ سال کی عمر میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ دوسرے دن صبح ½ ۱۲ بجے ان کے ہزاروں عقیدت مندوں اور جان نثاروں نے ان کے جسد خاکی کو پارک سرکس سے متصل ایک قبرستان میں جس کا نام "گورِ غریباں" ہے۔ یہ کہہ کر سپرد خاک کیا کہ ؎

اے تیرہ خاک خاطرِ مہماں نگاہ دار کیں نور چشم ماست کہ در بر گرفتہ ای

نوّر اللہ مرقدہٗ وبرّد اللہ مضجعہ۔

مولانا مرحوم کے نام اور مقام سے مجھے بہت پہلے سے واقفیت تھی۔ البتہ باقاعدہ نیاز اور تقرب ۱۹۵۹ء میں حاصل ہوا۔ جب مجھے مدرسہ عالیہ کلکتہ کی پرنسپلی تفویض ہوئی اور میں مدرسہ پہنچا مولانا مدرسہ کے ممتاز ترین اساتذہ میں تھے۔ تفسیر اور حدیث ان کے خاص موضوع تھے۔ اور ان دونوں فنون کی بیشتر متداول کتابوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ مدرسہ کی اونچی جماعتوں میں درس دیتے تھے۔ اور بڑی عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ میں مدرسہ میں کم و بیش ۵ سال رہا۔ اس پوری مدت میں میرے ان کے تعلقات

مخلصانہ رہے۔ اور جب میں وہاں سے رخصت ہوا تو اس کے بعد بھی ان کا اخلاص برابر جاری رہا۔ وہ اکثر میرے غریب خانہ پر تشریف لاتے اور گھنٹوں بیٹھتے تھے۔ راقم الحروف بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ ان ملاقاتوں میں اکثر علمی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ کبھی کبھی حالات حاضرہ پر بھی تبصرے ہوا کرتے تھے۔ مولانا ان مجلسوں میں علم و حکمت کے موتی بکھیر دیتے تھے۔

مولانا کو لکھنے پڑھنے اور تصنیف کا شوق اوائل عمر ہی سے تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے ۱۹۴۹ء میں امام بیہقیؒ متوفی ۴۵۸ھ کی معرفۃ السنن والآثار[1] کی پہلی جلد بہت محنت سے تصحیح کر کے شائع کی۔ ان کا دوسرا اہم کام ابن حزم الاندلسی (متوفی ۴۵۶ھ) کی اسماء الصحابہ والرواۃ کا پہلا ایڈیشن ہے جسے ادارۂ ترجمہ و تالیف کلکتہ نے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا۔ اس کتاب پر مولانا نے مفید حواشی بھی لکھے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی کتابت مولانا نے خود اپنے قلم سے کی ہے۔ ۱۹۷۲ء میں انھوں نے ایک ادارہ ادارۂ ترجمہ و تالیف کے نام سے قائم کیا جس کے اغراض و مقاصد میں سیرۃ کے موضوع پر نایاب مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کا شائع کرنا بھی تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے ابن قتیبہ کی مشہور تصنیف کتاب المعارف کا وہ حصہ جس کا تعلق سیرت سے ہے۔ اپنے چھوٹے صاحبزادے مولوی طلحہ بن ابوسلمہ ندوی سے اردو میں ترجمہ کرایا اور اسے بڑے اہتمام سے چھپوایا۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی النبی الخاتم جسے علامہ سید سلیمان ندوی صاحبؒ بہت پسند فرماتے تھے۔ عرصہ سے نایاب تھی۔ ادارہ نے اسے بھی بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ مولانا کو کتابیں جمع کرنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ وہ اپنی قلیل آمدنی کا بڑا حصہ اسی پر صرف کرتے تھے۔ ان کی زندگی ہمیشہ عسرت میں گذری۔ خصوصاً سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد پنشن ملنے میں کئی سال کی دیر ہوئی۔ اور وہ سخت مالی دقتوں میں گرفتار ہو گئے تھے۔ مگر اس زمانے میں بھی وہ کتابوں پر بے دریغ روپے خرچ کرتے تھے۔ راقم الحروف نے ان کے کتب خانے کے ذخیرے کا بڑا حصہ دیکھا ہے۔

[1] یہ کتاب اور اس کے علاوہ کتاب موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان (مولفہ حافظ نور الدین ہیثمی) (بقیہ صفحہ ۲۲۹ پر)

اور بلا خوف تردید کہہ سکتا ہے کہ کلکتہ میں کسی ذاتی کتب خانہ میں عربی مطبوعات کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود نہیں ہے۔ وہ خود فرماتے تھے۔ کہ مکہ معظمہ کی تاریخ پر کوئی ایسی مستند چھپی ہوئی کتاب نہیں ہے جو میرے کتب خانے میں موجود نہ ہو۔ وہ چار مرتبہ حج کے لیے تشریف لے گئے۔ ان موقعوں پر وہ حج کے معمولات ادا کرنے کے بعد مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے مختلف کتب خانوں میں پابندی سے جاتے تھے۔ اور کتب فروشوں کی دکانوں پر بھی گھنٹوں بیٹھتے اور اپنی پسند کی کتابیں خریدتے تھے۔ حج کے آخری سفر میں مکہ معظمہ کے کسی کتب خانے میں ان کی نظر تیسری صدی کے مشہور لغوی ابن درید کی جمہرۃ اللغۃ پر پڑی جو حال ہی میں مصر سے شائع ہوئی تھی۔ مولانا کو اس کا مقدمہ بہت اہم معلوم ہوا۔ اور انھوں نے اس کو نقل کرنا شروع کیا۔ اتفاقاً کتب خانے کے مہتمم کی نظر پڑی تو اس نے مقدمے کی عکسی نقل فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ مولانا جب ہندوستان واپس ہوئے تو یہ عکسی نقل اپنے ساتھ لائے۔ واپسی کے بعد راقم الحروف سے پہلی ملاقات ہوئی تو انھوں نے مقدمہ اسے پڑھنے کے لیے عنایت کیا۔ مولانا اس کے بعد سخت بیمار ہو گئے۔ مگر اپنے مرض الموت میں بھی وہ اس کتاب کو بھولے نہیں اور ہسپتال اور نرسنگ ہوم میں اس کے متعلق دریافت کرتے رہے۔ ۱۹ دسمبر کو یعنی وفات سے تین دن پہلے جب میں نرسنگ ہوم میں ان کو دیکھنے گیا تو ان کو بہت نحیف اور کمزور پایا۔ انھیں سخت زکام ہو گیا تھا۔ اور کھانس بھی رہے تھے۔ آواز بھرائی ہوئی تھی۔ میں کچھ فاصلہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ انھوں نے مجھے اشارے سے قریب بلایا۔ اور کچھ بولے آواز صاف نہیں تھی۔ اس لئے "کتاب" اور ایک آدھ لفظ کے علاوہ میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جمہرۃ اللغۃ ہی کے متعلق کچھ دریافت کر رہے تھے۔ میں انھیں کچھ بتانا چاہتا تھا۔ مگر ان کے تیمارداروں نے مجھے روکا اور ڈاکٹروں کی ہدایت کا ذکر کیا اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۸) اور کتاب الالزامات علی الصحیح البخاری والمسلم (مولفہ امام ابو الحسن علی دارقطنی) کی مولانا ابوسلمہ شفیع احمد نے اپنے خوشخط قلم سے کتابت کی تھی۔ اور یہ تینوں نسخے انھوں نے دارالمصنفین کو عنایت فرمائے۔

میں خاموش رہا۔ اس طرح جمہرۃ اللغۃ کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنے کی حسرت مولانا کے دل میں اور انھیں کچھ ضروری باتیں اس کتاب کے متعلق بتانے کی حسرت میرے دل میں رہ گئی۔

مولانا ایک خوش بیان اور کہنہ مشق مقرر بھی تھے۔ قدرت نے انھیں بلند آواز بھی عطا کی تھی۔ اسی بنا پر کلکتہ میدان میں عیدین کی نماز کی امامت کے لیے ایک مناسب خطیب اور عالم کی ضرورت پیش آئی تو نظر انتخاب مولانا ہی پر پڑی۔ کلکتہ میدان میں نماز عیدین کی جماعت کلکتہ کی سب سے بڑی جماعت ہوتی ہے۔ چند سال پہلے اس کی امامت امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد فرمایا کرتے تھے۔ جب مولانا آزاد اس سے دست بردار ہوئے تو ان کی جگہ پر مولانا ابوسلمہ مقرر ہوئے۔ اور تاحیات یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس موقع پر ان کے خطبات کلکتہ کے روزناموں میں رسالوں کی شکل میں چھپتے تھے۔ اور دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ اسی امامت کی بنا پر مولانا بعد میں پورے ملک میں "امام عیدین" کے لقب سے مشہور ہوئے۔

مگر مولانا کا اصلی میدان تبلیغ وارشاد تھا۔ وہ ساری عمر زبان اور قلم سے اشاعت اسلام اور مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی اصلاح کا کام انجام دیتے رہے۔ انھوں نے شہر کے مختلف حصوں میں درس قرآن کے حلقے قائم کیے جن میں وہ خود قرآن مجید کی تعلیمات کی وضاحت کرتے اور مسلمانوں کو شریعت کے احکامات سے روشناس کراتے تھے۔

شہر کے تمام مذہبی جلسوں میں شرکت کرتے اور ان میں نمایاں حصہ لیتے۔ تبلیغ کے لیے بہار، اڑیسہ اور مغربی بنگال کے دور افتادہ مقامات کا سفر کرتے۔ اکثر میلوں پیدل چلتے۔ ریل کے ڈبے میں بھیڑ کی وجہ سے کبھی کبھی گھنٹوں کھڑے کھڑے سفر کرتے۔ جلسوں میں بہت رات گئے تک بیٹھے رہتے جو ملتا اور جب ملتا کھا لیتے۔ مسجد میں بھی سو رہتے۔ جوانی اور کہولت میں ان کی عام صحت قابل رشک تھی۔ مگر ان بے اعتدالیوں نے ضعیفی میں ان کی صحت پر برا اثر ڈالا اور وہ بیمار رہنے لگے۔ اخیر زندگی میں ان پر

یرقان کا حملہ ہوا۔ جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔

تبلیغ کے کاموں کو مزید وسعت دینے کے لیے انھوں نے "ادارۂ ترجمہ وتالیف" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس میں وہ تنہا کام کرتے تھے۔ اس ادارہ سے جیسا کہ راقم السطور نے اوپر بیان کیا ہے۔ سیرت پر متعدد چھوٹے بڑے رسالے شائع ہوئے۔ جو ملک میں بے حد مقبول ہوئے۔ مقامی ضرورتوں کے پیش نظر وقتاً فوقتاً پوسٹر اور ہینڈبل بھی شائع کرتے۔ قرآن وحدیث کے منتخب ارشادات جلی حروف میں کپڑے پر لکھوا کر مسلمان محلوں کی مرکزی جگہوں میں آویزاں کراتے۔

مرحوم علم وعمل اور وضع واخلاق میں علما سلف کی یادگار تھے۔ وہی زہد وتقوی، وہی فقر واستغنا، وہی عبادت وریاضت، وہی ذکر وفکر، وہی جوش عمل، وہی اللہ کی خشیت، وہی ہر کام میں للٰہیت جو ان بزرگوں کی خصوصیات تھیں۔ مولانا کی زندگی کا طرۂ امتیاز تھیں۔ ہمیشہ گاڑھے کا کرتہ، گاڑھے کا پاجامہ اور گاڑھے ہی کی دوپلیا ٹوپی زیب تن فرماتے۔ زیادہ تر پیدل چلتے اور جب ضرورت پیش آتی سستی سواریوں مثلاً بس اور رکشے پر اکتفا کرتے۔ چنانچہ اکثر بھری بس یا ٹرام میں ان کی جیب کتر جاتی۔ آل رسول ؐ اور اصحاب رسول ؐ سے ایسی محبت اور شیفتگی تھی کہ گھر میں کسی بچے کا نام رکھنا ہوتا تو ان ہی کے نام ذہن میں آتے۔ چنانچہ اس وقت ان کے خاندان میں ماشاء اللہ طلحہ، عروہ، خزیمہ، قتادہ، اسامہ، ہریرہ، حذیفہ سبھی موجود ہیں۔ چار مرتبہ حرمین کی زیارت سے مشرف ہوئے آخری بار ۱۹۸۵ء میں حج کے لیے تشریف لے گئے۔ روانگی سے پہلے یرقان کا حملہ ہو گیا تھا۔ مکہ معظمہ پہنچے تو مرض نے شدت اختیار کر لی مشکل سے مناسک حج ادا کر سکے۔ کلکتہ واپس ہوئے تو مرض نے ایسی خطرناک شکل اختیار کی اور ان کو ہسپتال میں داخل کرنا پڑا اور پھر آخرت کا سفر پیش آیا۔

مرحوم نے بستر علالت سے ایک خط مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو لکھا تھا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے مولانا مرحوم کی جسمانی تکلیف وذہنیت اور قوم کی زبوں حالی پر ان کا روحانی کرب واضطراب

ظاہر ہوتا ہے۔ اس خط کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

"..... شفاخانے کے کوٹھری نما کمرے میں محبوس ہو کر رہ گیا ہوں۔ جملہ مشاغل یک قلم موقوف ہیں۔ امت مرحومہ کی موجودہ زبوں حالی بالخصوص مسلم پرسنل لا پر دشمنوں کے رکیک حملے اور ہماری تہیدستی و بے بسی پر دل کڑھتا ہے۔ مگر مجبور محض ہو کر رہ گیا ہوں یہ چند سطور جو در اصل اپنی غم خواری اور دلسوزی کا برملا اظہار ہیں۔ وقت کی اہم ضرورت سمجھتے ہوئے لکھوا رہا ہوں"۔

مولانا مرحوم کے اساتذہ میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ابو عبد اللہ محمد بن یوسف السورتیؒ، اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن بزرگوں کا ذکر خیر وہ اکثر کیا کرتے تھے ان میں مولانا ابو الکلام آزادؒ، مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ، مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانیؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے انھیں والہانہ عقیدت تھی۔ جب سید صاحب گرمیوں میں دلسینہ تشریف لاتے تو مولانا بالالتزام ہر سال ان سے ملنے کے لیے بہار شریف سے دلسینہ جاتے اور دو تین دن ان کے مہمان رہتے۔ راقم الحروف سے انھوں نے سید صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر جو پٹنہ جنکشن اسٹیشن پر ہوئی تھی کئی بار مزہ لے لے کر کیا۔ دلسینہ کی ان مجلسوں کا ذکر بھی لطف لے لے کر کرتے تھے۔ جن میں سید صاحب اپنے باغ کے آم خود کاٹ کاٹ کر لوگوں کو پیش کرتے تھے۔ مولانا سید صاحب کے منتخب مطبوعہ مضامین کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر صرف ایک مجموعہ شائع کر سکے۔ جو مکتبۂ علم و حکمت، بہار شریف کے زیر اہتمام طبع ہوا۔ پھر انھوں نے ان کے دو پرانے مضامین رسول وحدت اور ایمان رسالوں کی شکل میں ادارۂ ترجمہ و تالیف، کلکتہ سے شائع کئے۔ اور جن بزرگوں کے نام مذکور ہیں ان میں سے اکثر سے ان کی خط و کتابت تھی اور چند کے خطوط مولانا کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ شاگردوں کی ایک کثیر تعداد برصغیر ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں علمی و تعلیمی خدمات انجام دے رہی ہے۔

مولانا کی وفات کے بعد میں اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس کر رہا ہوں۔ ان کی خوش گفتاری، ان کا زور خطابت، ان کا اخلاص، اور ان کی علمی صحبتیں یاد آتی ہیں۔ تو آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں مگر مولانا ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں سے لوگ واپس نہیں آتے ؎

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

مطبوعات جدیدہ

اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی: مرتبہ ڈاکٹر شکیل احمد متوسط تقطیع کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ، صفحات ۲۲۴ مجلد مع خوبصورت گردپوش، قیمت ۵۰ روپیے، پتہ نصرت پبلشرز حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ۔

یہ ڈاکٹر شکیل احمد کا تحقیقی مقالہ ہے اس پر گورکھپور یونیورسٹی نے انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی ہے اس میں آغاز سے ۱۹۴۷ء تک کے اہم اور معیاری اردو افسانوں کا جائزہ لیکر ان میں پیش کئے گئے سماجی مسائل و واقعات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ پہلے باب میں اردو افسانہ کی ابتدا و ارتقا کا ذکر ہے، اس میں اس کی تعریف و تشریح کر کے ناول سے اس کا فرق دکھایا ہے۔ اس کے اہم اجزا اور تشکیلی عناصر عنوان، موضوع، پلاٹ، کردار، زبان و بیان، مقصد و ماحول اور ایجاز و اختصار پر بھی بحث کی ہے اور اس کی مقبولیت کے اسباب بتائے ہیں، افسانہ کے مقصد و منہاج کی وضاحت کر کے ثابت کیا ہے کہ اس میں عہد و ماحول کی ترجمانی اور سماجی مسائل کو خاص طور پر موضوع بحث بنایا گیا ہے اور اس حیثیت سے اس کے اندر بیسویں صدی کے نصف اول کے ہندوستان کے سماجی، معاشی اور سیاسی حالات اور قومی و اصلاحی تحریکوں کی نمایاں تصویر ملتی ہے، مصنف نے ادب یا افسانے میں سماجی مسائل کی جھلک پیش کئے جانے کی ضرورت اور گنجائش پر بحث کر کے ادب و زندگی کے رشتہ و تعلق کو واضح کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ اچھے اور کامیاب افسانہ میں زندگی کی حقیقی تصویر اور سماج کا جیتا جاگتا پیکر اعتدال کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے، اس سلسلہ میں ترقی پسند ادبی تحریک کے اردو افسانہ پر اثرات بھی دکھائے ہیں۔ دوسرے باب میں اس عہد کی سماجی بیداری کا ذکر ہے اس سلسلہ میں ان مسائل کا احاطہ بھی کیا گیا ہے جو اس دور میں پیدا ہوئے اور جن کے اثرات اردو افسانوں پر بھی پڑے اور جن کے تدارک کے لئے ملک میں اصلاحی و مذہبی اور قومی و سیاسی تحریکیں وجود میں آئیں، مصنف نے ان تحریکوں کے اثرات کا جائزہ لیا ہے اس طرح یہ باب اس عہد کے ذہنی، فکری، تعلیمی، تہذیبی اور سماجی مسائل کے جائزہ پر مشتمل ہے اس کے بعد پانچ ابواب میں ان سماجی مسائل کی

تفصیل قلمبند کی ہے جن کی ۱۹۴۷ء سے پہلے کے افسانوں میں جھلک دکھائی دیتی ہے، مثلاً عدم مساوات، نابرابری، ذات پات اور اونچ نیچ کا فرق، چھوت چھات، رشوت ستانی، معاشرتی انتشار، ذہنی و اخلاقی پستی، معاشی بدحالی، جہالت، غربت، بے روزگاری، عصمت فروشی، جہیز، تلک، بے میل اور کم سنی کی شادی، زمینداروں اور کاشتکاروں کی کشمکش، مالکوں اور مزدوروں کے جھگڑے، جاگیرداری اور طبقہ داریت، تعصب، تنگ نظری، فرقہ داریت اور غلامی وغیرہ، مرتب نے سہولت کے خیال سے ان مسائل کو مختلف ابواب میں علٰحدہ علٰحدہ ذکر کیا ہے، تین ابواب عورتوں کے سماجی مسائل کیلئے مخصوص ہیں، تیسرے باب میں عورتوں کے ان ازدواجی مسائل کا بیان ہے، جن سے روزمرہ گھریلو زندگی میں دوچار ہوتی ہیں، جیسے بے میل، نابرابری، کمسنی کی شادی، تلک، جہیز اور دوسرے تباہ کن رسم ورواج، ستی اور بیوہ کی شادی کی ممانعت وغیرہ، چوتھے باب میں خواتین کے ان معاشرتی و سماجی مسائل سے تعرض کیا گیا ہے، جو انھیں گھر سے باہر کی زندگی میں پیش آتے ہیں، اس میں بیواؤں کے ساتھ ناانصافی، اور خودکشی وغیرہ کے اذیتناک سماجی مسائل کی تصویر اردو افسانوں کی مدد سے پیش کی گئی ہے، پانچویں باب میں اخلاقی پستی اور سماجی برائیوں کے پس منظر میں عورتوں کے استحصال کا ذکر افسانوں کی روشنی میں کیا گیا ہے، اس میں طوائفوں کے مسئلہ کا مکمل جائزہ لیا ہے، مرتب کا خیال ہے کہ یہ مسئلہ سماج کی غربت، بیواؤں کے ساتھ غیر انسانی برتاؤ اور بیوگی کی شادی کی ممانعت کا آتش فشاں ہے، چھٹے باب میں سماجی نابرابری، چھوت چھات، رنگ و نسل اور ذات برادری کی تقسیم اور اعلیٰ ذاتوں کے ادنیٰ طبقوں کے استحصال کی وجہ سے ہندوستانی سماج میں پائے جانے والے انتشار اور مفاسد، رشوت، اقربا پروری، علاقائی کشمکش، لسانی تنگ نظری، فرقہ وارانہ منافرت اور مذہبی اجارہ داری اور اس نوعیت کی دوسری بدعنوانیوں کے بارہ میں افسانہ نگاروں کے کربناک جذبات و احساسات کی تصویر کشی کی گئی ہے، ساتویں باب میں غلام اور غریب ہندوستان کی جیتی جاگتی تصویر کے جو مختلف رخ اردو افسانے میں پیش کئے گئے ہیں، اس کی تفصیل دی ہے، اس میں انگریزوں کی سخت گیر زرعی پالیسی، عوام کے افلاس، مزدوروں اور کسانوں کی معاشی بدحالی، ساہوکاروں کی شیطنت، زمینداروں کے جبر، امیر و غریب اور مالک و مزدور کی کشمکش اور گھریلو صنعتوں کی تباہی وغیرہ کا حال تحریر کیا ہے۔ لائق مرتب نے اردو افسانوں کے توسط سے جن سماجی مسائل کی عکاسی کی ہے، ان کے سلسلہ میں ۱۹۴۷ء سے پہلے کے اکثر ممتاز اور اہم افسانہ نگاروں کے منتخب و معیاری افسانوں کا حوالہ دیا ہے، لیکن سب سے زیادہ پریم چند کے افسانوں کو موضوع بحث بنایا ہے، ان کو اخذ و استنباط کا اچھا سلیقہ ہے اور انھوں نے اردو افسانوں کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے، اس لیے معیاری افسانوں کا عطر اس کتاب میں آگیا ہے، افسانہ نگاروں کے بارہ میں مناسب اور نپی تلی رائے بھی دی گئی ہے، اور افسانوں کے زشت و خوب کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے اور بعض افسانہ نگاروں کا باہمی تقابل بھی ہے، مصنف کے خیالات اور نقطۂ نظر میں اعتدال، توازن اور سلامت روی اور تحریر و طرز نگارش میں متانت اور شگفتگی ہے بحث و استدلال کا انداز بھی دلنشین ہے، یہ اگرچہ ایک تحقیقی مقالہ ہے، لیکن مصنف کی کد و کاوش اور تلاش و تفحص کی وجہ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کے عام مقالوں سے بہت فائق ہے، اس کتاب سے ان کی بہتر استعداد، اچھے ذوق اور تصنیفی سلیقہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

مجلہ صد سالہ یوم پیدائش علامہ سید سلیمان ندوی } مرتبہ جناب صبیح محسن صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۸۰، قیمت درج نہیں۔ پتہ دلیسنہ ایسوسی ایشن، کراچی۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کے وطن دلیسنہ (بہار) کے کراچی میں مقیم کچھ اصحاب نے وہاں دلیسنہ ایسوسی ایشن کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہے جو ہر سال انکی برسی کے موقع پر اہتمام سے جلسے منعقد کر کے انکو خراج عقیدت پیش کرتی ہے، ۱۹۸۴ء میں ایسوسی ایشن نے سید صاحب کے صد سالہ یوم پیدائش کی مناسبت سے یہ باوقار مجلہ شائع کیا ہے، اس میں سید صاحب کے عزیزوں، تلامذہ اور معتقدین نے انکی سیرت، شخصیت اور کمالات کے دلکش جلوؤں اور اہم پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے، مجلہ کی ابتدا سید صاحب کے ممتاز شاگرد مولانا عبدالقدوس ہاشمی کے دلچسپ ذاتی تاثرات و مشاہدات سے کیگئی ہے، جناب سید صباح الدین ناظم دارالمصنفین کے دو مضامین بھی اس میں شامل کئے گئے ہیں، ایک میں سیرت النبی جلد ششم کے مضامین و مطالب کا خلاصہ اور تجزیہ پیش کر کے اس جلد کی عظمت، اہمیت اور جامعیت دکھائی گئی ہے اور دوسرے میں ان کا مختصر مگر جامع سوانحی خاکہ تحریر کیا ہے، اس مجلہ کا زیادہ اہم اور خاص مضمون سید صاحب کے برادر زادہ اور خویش جناب سید ابوعاصم ایڈوکیٹ کا ہے، انھوں نے سید صاحب اور دارالمصنفین کا سرمایہ اور ان کے وطن دلیسنہ کی تاریخی عظمت دکھائی ہے اور انکی تعلیم و تربیت کے انداز اور دوسرے حالات و کمالات پر بحث کی ہے، اس سے سید صاحب کے لطف و شفقت علمی و تصنیفی انہماک اور عظمت و وقار کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے، اس مجموعہ کا ایک طویل مضمون ڈاکٹر سید

محی احمد ہاشمی صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی کا ہے، اس میں ندوہ کے تعلق سے سید صاحبؒ اور مولانا شبلیؒ کا مفصل تذکرہ ہے۔ ابراہیم خلیل صاحب نے سید صاحب کی عظمت و بلند پایگی دکھانے کے بعد انکی تمام تصنیفات کا اجمالی تعارف کرایا ہے، جناب مصباح دسنوی نے انکے اور ڈاکٹر اقبال کے ایک دوسرے کے بارے میں اعترافات قلمبند کئے ہیں، سید صاحب کے خاص مسترشد ڈاکٹر غلام محمد نے انکی ظرافت کے بعض دلچسپ واقعات تحریر کئے ہیں، سید شہاب الدین دسنوی اور ابو علی اعظمی کے مضامین بھی اچھے ہیں، اس مجلہ میں سید صاحبؒ کو منظوم خراج عقیدت بھی پیش کیا گیا ہے اور انکے چند عالمانہ خطوط بھی نقل کئے گئے ہیں جو ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کو ان کے علمی استفسارات کے جواب میں تحریر کئے گئے ہیں، شروع میں سید صاحبؒ کی بیگم صاحبہ اور جناب حسین امام کا پیغام بھی درج ہے، سید صاحب اور دسینہ ایسوسی ایشن کے ارکان کی تصویروں سے بھی یہ مجلہ مزین ہے، دسینہ ایسوسی ایشن کے ارکان لائق مبارکباد ہیں، کہ انھوں نے اپنے وطن کی مایۂ ناز اور لائق فخر شخصیت کی یاد میں یہ مجلہ شائع کیا جو مفید اور معلوماتی مضامین پر مشتمل ہونے کی وجہ سے لائق مطالعہ ہے۔

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	سید اقبال احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	" "
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
اڈیٹر	سید صباح الدین عبد الرحمٰن
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہے اور سچ ہیں۔

سید اقبال احمد

جلد ۱۳۷ ماہ رجب المرجب و شعبان المعظم ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۸۶ء عدد ۴

مضامین

شذرات — سید صباح الدین عبد الرحمٰن — ۲۲۲ - ۲۲۴

مقالات

امام اشعری اور مستشرقین — جناب مرزا محمد یوسف صاحب، سابق استاد مدرسہ عالیہ رام پور — ۲۲۵ - ۲۶۲
"خیام" — سید صباح الدین عبد الرحمٰن — ۲۶۳ - ۲۸۸
حضرت مجدد الف ثانیؒ اور فیضی و ابو الفضل کے تعلقات و اختلافات پر ایک اجمالی نظر — جناب محمد اسحٰق صاحب، اسماعیل اسٹریٹ کلکتہ — ۲۸۹ - ۳۰۰

تلخیص و تبصرہ

الندیم اور اس کی کتاب الفہرست — محمد عارف عمری، دار المصنفین، اعظم گڈھ — ۳۰۱ - ۳۱۰
مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۳۱۱ - ۳۱۶